11

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب میں شامل مضامین کی تعداد
۲۰ ہے اور صفحہ ۹۹ سے ۱۱۱ تک
تعزیت نامے اور اخبارات مقامی
کے تعزیتی اداریے ہیں
سارے مضامین مقامی اہل وطن یعنی
حیدرآباد دکن سے متعلق شخصیتوں کے ہیں
مقامی اخبارات و رسائل سے اس خصوص
میں استفادہ کر کے انہیں مرتب کیا گیا

بہادر یار جنگ

مشاہیر وطن کی نظر میں

مرتبہ :- نذیر الدین احمد

بہادر یار جنگ

مشاہیرِ وطن کی نظر میں

(مرتبہ)

نذیر الدین احمد (عثمانیہ)
سابق کونسلر

بہ اہتمام

الحاج نواب نصیب خاں صاحب
(فرزند آغوشی حضرت قائد ملت بہادر یار جنگ رح)

قیمت: دو روپے

طبع اول	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	مارچ ۱۹۷۹ء
قیمت	دو روپے
کتابت	محمد مظہر
ٹائیپ (مسودات)	عبدالقادر (ٹائپسٹ)
سرورق ڈیزائن	ایم۔ اے غفار (آرٹسٹ)
طباعت سرورق	ڈالفن پریس
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد

بہ اہتمام: الحاج نواب نصیب خاں (فرزند آغوشی حضرت قائد ملت)

ملنے کے پتے:-

۱۔ سوپر سانک کاپینگ سنٹر، دیوان دیوڑھی حیدرآباد ۲۔۔۔۔ ۵

۲۔ انجمن مہدویہ چنچل گوڑہ حیدرآباد ۲۳۔۔۔ ۵

۳۔ حیدر اینڈ سنس مچھلی کمان حیدرآباد ۲۔۔۔۔ ۵

۴۔ حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۲۔۔۔۔ ۵

انتساب

حضرت قائدِ ملّتؒ کے شیدائی مولوی محمد رحمت علی خاں شموزئی مرحوم سے قائدِ ملّت کے سب ہی شیدائی آشنا ہیں۔

قائدِ محترمؒ کی نگارشات کی اشاعت کا کام ۱۹۶۸ء میں شروع ہوا۔ اس وقت یہ مردِ قلندر گھر گھر مجھے ساتھ لیے پھرتا رہا تاکہ مجھے مطلوبہ مواد حاصل ہو۔

اور ہر قدم پر میری ہمت افزائی کی۔ وہ ایک مخلص اور دیندار انسان تھے خلقِ خدا کی خدمت ان کا شعار تھا۔

وہ میرے عزیز دوست جناب سردار علی خاں صاحب (سابق رکن بلدیہ) ہی کے حقیقی ماموں نہ تھے وہ میرے بھی ماموں تھے۔

چھوٹوں پر الطاف و عنایات، مہر و کرم کی بارش ان کے مزاج میں داخل تھی۔

حضرت قائدِ ملّت سے انھیں عشق تھا۔ جب بھی لسان الامت کا ذکر آتا وہ سرتاپا تصویرِ غم بن جاتے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔

اس موقعہ پر زیرِ نظر کتاب "بہادر جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں" مولوی رحمت علی خاں صاحب شموزئی کے نام معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں اور میری دعا ہے کہ:

اللہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

ابتدائیہ

حضرت قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے عرصہ سے یہ خیال تھا کہ قائدِ محترم کے ارشادات و نگارشات تقاریر و سوانح کو ترتیب دے کر شائع کیا جائے۔

قائدِ ملت کے انتقال کے پورے ۲۶ برس بعد حصول مواد کی جد و جہد کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ ہر طرف بکھری ہوئی تھی داستاں ان کی۔

شانِ خداوندی ہے کہ

ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

کئی سال کی مسلسل جد و جہد رنگ لائی، حضرت قائدِ ملت کی وفات کے ۲۶ سال بعد پہلی مرتبہ ایک منظم پروگرام کے تحت حضرت قائدِ ملت کے نقوش قلم کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا اور ۱۹۶۸ء میں پہلی کتاب "نگارشاتِ بہادر یار جنگ" شائع ہوئی اس طرح حضرت قائدِ ملت کی دس کتابیں اور اس سلسلے کی آخری کڑی بہادر یار جنگ کی ڈائری مارچ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔

نامساعد اور حوصلہ شکن حالات کے باعث یہ سلسلہ ۱۹۷۱ء میں بند ہو گیا مسلم قوم کی اپنے اسلاف سے غفلت اور سرد مہری کوئی نئی بات نہیں مگر بروشنگ نے اس تلخ حقیقت کے نتائج سے اقوام و ملل کو باخبر کیا تھا کہ "جو قومیں اپنے

اسلاف کے کارناموں کو بھلا دیتی ہیں، تاریخ بھی ان قوموں کو فراموش کر دیتی ہے۔"
یہ اللہ کا کرم تھا کہ دسمبر ۱۹۷۸ء میں بہادر یار جنگ اکیڈیمی (کراچی)
سے مولوی وجیہ الدین خاں صاحب بوزئی معتمد اعزازی بہادر یار جنگ اکیڈیمی
حیدرآباد تشریف لائے جو مجسّم خلوص، عاشق بہادر یار جنگ، فرض شناس
دردمند ملّت، دل مرتضیٰ اور سوز صدیق کی دولت سے مالا مال ایک عظیم
انسان ہیں۔

اسی مردِ مجاہد نے ۱۹۴۸ء میں کراچی کے خالق دینا ہال میں پہلی
مرتبہ بہادر یار جنگ میموریل سوسائٹی کے نام سے یوم بہادر یار جنگ کا انعقاد
عمل میں لایا جس جلسے کی صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی نے فرمائی مولوی ملک
غلام محمد (جو اس وقت وزیر خزانہ تھے) کے ہاتھوں اس جلسے کا افتتاح عمل میں آیا
پھر ایک ٹین پوش کمرے میں بہادر یار جنگ اکیڈیمی قائم ہوئی۔ ہر سال جلسے ہوتے
رہے اور یوم قائد ملت اس درجہ اہتمام سے منایا جانے لگا کہ اس دن پاکستان کا
ہر اخبار حضرت قائد ملت کی تصویر صفحہ اول پر شائع کرتا ہے اور اندرون صفحات
مشاہیر کے مضامین اور نواب صاحب کی تصاویر شائع کی جاتی ہیں۔

الحمد اللہ وہ ٹین پوش کمرہ اور اس سے متعلقہ وسیع و عریض زمین پر
آج کئی لاکھ روپے سے ایک عظیم عمارت تعمیر ہو چکی ہے جس میں قائد ملت
اکیڈیمی قائم ہے۔

بہادر یار جنگ کے یوم پیدائش پر ٹیلی وژن پر آدھے گھنٹہ کا پروگرام
کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور سے ریلے کیا جاتا ہے۔

لاہور، پشاور، کوئٹہ میں حضرت قائد ملت کے نام سے سڑکیں منسوب ہیں۔

پاکستان نیشنل میوزیم اس دن قائد ملتؒ کے لباس اور دیگر اشیاء و تحریروں کی نمائش کا اہتمام کرتا ہے۔

بہادر یار جنگ اکیڈیمی کی مساعی سے آج پاکستان کی نئی نسل قائد ملت کے کام اور مقام سے آگاہ ہے۔

بہادر یار جنگ اکیڈیمی نے،

(۱) بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔

(۲) تاثراتِ دکن۔

(۳) ارمغانِ دکن۔

(۴) دکن کا آخری تاجدار۔ (۵) حیات بہادر یار جنگ۔

یہ پانچ کتابیں بڑے سلیقے اور بڑی محنت سے مرتب کر کے فوٹو آفسٹ پر شائع کیے ہیں۔

۲۹ سال کے عرصے میں پاکستان سے مولوی وحید الدین خاں صاحب بوزنی کی خصوصی دلچسپی قائد ملت سے ان کے والہانہ عشق سے اتنے اہم کام انجام پائے۔ انشاء اللہ دو سال کے اندر اندر مولوی وحید الدین خاں بوزنی اور دیگر عہدیدارانِ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کے اشتراک سے حضرت قائد ملتؒ کے جملہ نگارشات و تقاریر اور ان پر لکھے گئے مضامین منظر عام پر آئیں گے۔ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کے لائق صدر مولوی احمد خاں صاحب کی شخصیت، قائد ملت کے چاہنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کے نام اور کام سے قومی جذبہ رکھنے والا ہر فرد متعارف ہے۔ آپ نے قائد ملت کی وفات کے بعد "ہمارا قائد" نامی ایک دلچسپ تاریخی دستاویز شائع فرمائی تھی۔

جو مقبول خاص و عام ہوئی۔ کئی علمی و ادبی موضوعات پر آپ کی کتابیں پاکستان سے شائع ہوئیں۔ صف اول کے مصنف و محقق اور جادو بیاں مقرر کی حیثیت سے آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

ہم صدر و معتمد بہادر یار جنگ اکیڈیمی سے پُر امید ہیں کہ ہر دو اصحاب اس وقت تک اکیڈیمی کو وقت دیتے رہیں گے اور اپنے آپ کو اکیڈیمی کے لیے وقف کر دیں گے جب تک نواب صاحب کا ایک ایک لفظ شائع نہ ہو جائے۔

بات سے بات چلی تو کچھ باتیں بطور تعارف لکھنا پڑا ورنہ ــ

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لیے

مولوی وحید الدین سلیم کی رحلت حیدر آباد آنے کے بعد قائد ملت سے متعلق اہل دکن کی سرد مہری، اپنوں کی طوطا چشمی، عزیز و اقارب کی غفلت شعاری کو دیکھ کر روپڑے، کم کوش سہی لیکن بے ذوق نہ تھے راہی، دو صلہ بندہ مخلصین سے ملاقاتیں کیں، گروپ میٹنگ ہوئے، پھر جلسہ عام کا سلسلہ چلا، دل سے دل کے چراغ جلے، ہر روز کوئی نہ کوئی اجتماع (اور دن میں دو دو اجتماع بھی) صحافت اہل خرد، مصنف، لیڈر، سب سے ایک ہی پروگرام پر بات ہوتی، بات سے بات بنتی گئی۔ بے حسی کے اونٹ نے انگڑائی لی۔ قائد ملت کے چاہنے والوں کو اپنے فرائض یاد آئے۔ سب کمربستہ ہوگئے اور ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو ہر طرح یادِ قائد ملت کو باقی رکھنے کا عزم کر چکا ہے۔

روزنامہ "سیاست" نے بھی ہمیشہ کی طرح اس پیام کی اشاعت میں اپنے صحافتی فرائض کی تکمیل کی، اور امید ہے کہ اس سال یوم قائد ملت کے موقعہ پر "سیاست" کا سپلیمنٹری شائع کرے گا۔

دکن کے مشہور اخبار رہنمائے دکن کے لائق مدیر نے شہر یار الملک کی ڈیوڑھی میں منعقدہ جلسہ یادِ قائدِ ملت میں اعلان فرمایا کہ سال حال رہنمائے دکن، قائدِ ملت کی برسی کے موقعہ پر اپنا خصوصی نمبر شائع کرے گا۔

انجمن مہدویہ چنچل گوڑہ کے ارباب مجاز نے یادِ قائدِ ملت کے جلسے میں جو انجمن مہدویہ کی طرف سے منعقد ہوا تھا اعلان کیا کہ انجمن کی وسیع و عریض زمین پر انجمن مہدویہ کی جانب سے عنقریب "بہادر یار جنگ ہال" کی تعمیر عمل میں آئے گی۔

بہادر یار جنگ کے بے اعتماد ساتھی مولوی عبدالرحمٰن سعید نے حضرت قائدِ ملت کے حالاتِ زندگی پر مشتمل کتاب لکھنے کا نہ صرف ارادہ فرمایا بلکہ کام کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔

اس طرح ملت کے دانشور اور اربابِ فکر و نظر اس خصوص میں اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل پر آمادہ عمل ہو گئے۔

۱۹۷۱ء تک میرا جو کام قائدِ ملت اکیڈیمی کے تحت دس کتابوں کی اشاعت پر ختم ہو گیا تھا، اور ایک جمود کا عالم تھا مولوی وحید الدین خاں بورنی کی آمد نے مجھے بھی آ[illegible] بہ کار کر دیا۔ اور اب ایک نئے حوصلے اور نئی امنگ کے ساتھ قائدِ ملت کے نقوش قلم، تقاریر اور ان پر مشاہیر کا نذرانۂ عقیدت یہ ساری چیزیں جو قوم کی امانت ہیں ان کی اشاعت کا کام پھر سے شروع کر دیا گیا ہے۔

اس خصوص میں نواب نصیب خاں صاحب فرزند آغوشی حضرت قائدِ ملتؒ نے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ اس سے قبل

بھی انھوں نے کتابوں کو خرید کر سارے ہندوستان کے کتب خانوں کو بطور تحفہ کتابیں دیں۔ اس طرح بہادر خاں کے پیغام کو عام کرنے میں ان کی مدد شریک رہی۔ میرے عزیز دوست جناب سردار علی صاحب (سابق رکن بلدیہ) نے اس عظیم کام میں از ابتداء تا ایں دم ہر قدم پر میری مدد و رہنمائی فرمائی۔ جن کا شکریہ اس لیے ادا نہیں کرتا کہ اس طرح ان کے خلوص کی نفی ہو جائے گی۔

قائد ملت کے چاہنے والوں سے بھی پوری پوری امید ہے کہ وہ ہمارے اس عظیم کام کی تکمیل میں ہماری ہر ممکنہ مدد فرمائیں گے۔

زیر نظر کتاب "بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں" اور اس سلسلے کی مزید پانچ کتابیں جو حضرت قائد ملتؒ کے حالات زندگی پر مشتمل ہیں، ان کتب کی اشاعت کا مقصد نئی نسل کو عظیم قائد کے کام اور مقام سے آگاہ کرنا ہے تاکہ قوم جمال الدین افغانی کے خواب کی تعبیر اور اقبال کے شاہین زادے محمد بہادر خاں جس نے ملت اسلامیہ کے خدمت گزار کی حیثیت سے پرستاران رب کعبہ کے متعینہ مقصد حیات کے حصول کی جدوجہد میں اپنی جان تک جاں آفریں کے سپرد کر دی، پوری طرح واقف ہو جائیں اور انھیں اس حقیقت کا علم ہو کہ ؎

باغباں جب اپنا خون دل نذر لا نہیں سکتے
پھول سوکھ جاتے ہیں مسکرا نہیں سکتے

دوبارہ اس کام کی تکمیل میں مصائب و صعوبتوں

کا مجھے پورا پورا اندازہ ہے مگر حوصلہ و امنگ ہو تو راستے کی دشواریاں راستہ نہیں روک سکتیں ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
دل خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

نذیر الدین احمد
سابق رکن بلدیہ

۷۲۳ - ۶ - ۲۱ چیلہ پورہ، حیدرآباد
آندھرا پردیش - انڈیا

بیگم صاحبہ قائدِ ملّت (خلد مکانی)

سہاگ لُٹنے کی کہانی۔ بیگم قائدِ ملّت کی زبانی

دوپہر کے کھانے کے لیے میرے سرکار اندر آئے۔ میرے ساتھ کھانا کھایا۔ بعد ازاں لیٹ گئے۔ عادت کے مطابق لیٹتے ہی انھیں نیند آ گئی۔ میری بھی آنکھ لگ گئی۔ چار بجے اچانک آنکھ کھلی۔ دیکھتی ہوں کہ کپڑے پہن چکے ہیں اور ہاتھ میں جوتے لیے ہوئے کوٹھی سے باہر نکل جانا چاہتے ہیں۔ مجھے ہوشیار دیکھ کر کہنے لگے "ارے تم اٹھ گئیں۔ اتنے برس تک تم برابر جوتے پہناتی رہی ہو آج ارادہ تھا کہ میں پہن لوں گا۔" اتنے میں چپراسی آئی اور پڑھ کر باہر چلے گئے انھیں میں برابر ۲۷ برس سے جوتے پہناتی آئی ہوں آج اس سعادت پر محروم رہنے پر افسوس ہو رہا تھا۔

رات میں پونے نو بجے باہر سے انھوں نے پان منگوائے۔ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ میں ان کے لیے آخری پان تیار کر رہی ہوں۔ مجھے ہمیشہ اس پر ناز تھا وہ میرے سوا کسی کے لگائے ہوئے پان نہیں کھاتے۔

انھوں نے پانچ بجے ہی کہلا بھیجا تھا کہ آج دعوت میں جا رہے ہیں اور میرے ساتھ کھانا نہ کھائیں گے۔ پھر بھی میں انتظار میں تھی کہ جاتے ہوئے اندر آئیں گے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد موٹر کی آواز آئی اور میں نے اوپر سے دیکھا کہ میرے سرتاج جا چکے۔

میرے لیے کھانا چنا گیا لیکن نہیں معلوم کیا بات تھی مجھ سے کھایا نہ جا رہا تھا۔ عجیب بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ نوکروں نے مجھے بیحد مجبور کیا لیکن میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی میں نے جوں توں ختم کیا اور پان کھانے کے لیے تخت پر آکر بیٹھی۔ ابھی میں نے پاندان کو ہاتھ لگایا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا میرے حلق میں پھندا پڑ گیا ہے کہ اتنے میں اطلاع آئی کہ دعوت میں میرے سرتاج بے ہوش ہو گئے۔

نہ جانے کیوں میری زبان سے نکلا "جب گولی لگی تب بے ہوش نہیں ہوئے میرے ہاں سیدھے چلے آئے تھے آج کیا ہوا۔

میرا دل مسوس رہا تھا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی میری دو بھاوجیں آگئیں اور میں نے ان سے کہا کہ ہاشم علی خاں صاحب کے مکان جا رہی ہوں، مجھے چین نہیں آ رہا ہے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلیں گی۔ میں نے سمجھا کہ ڈرائیور نہ ہوگا اور مجھے جانے میں بڑی دقت ہوگی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ڈرائیور سے سرکار نے کہا تھا کہ "ممکن ہے مجھے واپسی میں دیر ہو جائے تمھیں دیر ہوگی میں خود موٹر چلا لوں گا۔

میری دونوں بھاوجیں اور میں ہاشم علی خاں صاحب کے گھر پہنچے۔ میں دوڑی ہوئی اپنے سرتاج کے پاس پہنچی۔ جن جوتیوں کے نہ پہنانے سے مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا انھیں میں نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے سرتاج کے سینے اور پیشانی کو محسوس کیا۔ ان میں اب بھی گرمی تھی، روح قفس عنصری سے کچھ عرصہ قبل پرواز کر چکی تھی۔ میرا سرتاج میرا سہاگ اپنے ساتھ لیتا چلا گیا۔ خدا انھیں جوار رحمت میں جگہ دے ۔ آمین۔

مترجم: محمد عبدالرحمٰن صدیقی

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو آنجہانی کا نالۂ شیون

اپنی حرماں نصیبی کے نشتر اول سے گھائل ہو کر چونکہ ہم ابھی اندوہ غم کے سیلاب میں غوطے کھا رہے ہیں اس لیے اس ملی نقصان کا صحیح صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے جو ایسی ہستی کی بے وقت موت کی وجہ سے عائد ہوا ہے جس نے اپنی زندگی ہی میں وہ عظیم المرتبت حیثیت اختیار کر لی تھی جس کی نظیر صرف ماضی کی داستانوں میں ملتی ہے۔

اس نوجوان دلیر افغان سپاہی کی ذات جو سب کو اس درجہ محبوب اور ہر دلعزیز تھی۔ جسے شباب کی عین فصل بہار میں موت کے پنجہ نے نہایت المناک طریقہ پر ہم سے جدا کر دیا۔ جس کی مفارقت پر ملک کے وسیع طول و عرض میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔

اس کی ذات کہیں زیادہ ان صفات سے متصف تھی جو اس کی اپنی بہادر اور شجیع نسل کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ فطرت نے اس کو جسم، دماغ اور شیر کے موثر اور نمایاں محاسن اس محیر العقول فیاضی کے ساتھ عطا کیے کہ ساری دنیا اس کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ اس کی ذات، جرأت، حسنِ باطن، اخلاص، سادگی پُرجوش اور عالی ہمت انسانیت سے متصف تھی جس نے مختلف مذہب اور مسلک کے بے شمار انسانوں کو وابستۂ دامنِ الفت بنا لیا تھا۔

اس کی خطابت کی سحر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حسن و کمال سے ان گنت قلوب کے اندر ہیجان پیدا کر دیا۔ حریت کی راہ میں اس کا جذب درون ناقابلِ شکست اور ان تمام مقاصد کے لیے جس کی اس نے ان تھک جوش و سرگرمی کے ساتھ حمایت کی اس کا جذبۂ اشتیاق بے باک تھا، ان تمام نعمتوں کے منجملہ خداداد مسلمہ قیادت کی سب سے بڑی نعمت جو قوموں کی زندگی میں بہت کمیاب ہوتی ہے اس مردِ مجاہد کو حاصل تھی۔ اگر اس کی عمر وفا کرتی تو زمانہ کا امتداد اس نعمت کے حسن کو دوبالا کر دیتا اور تجربہ کی پختگی اس کو ملت کی ایسی گراں مایہ متاع کی صورت میں تبدیل کر دیتی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم اسلام کی خدمت کے لیے مفید ثابت ہوتی لیکن بہادر خاں جیسے انسان درحقیقت فنا نہیں ہوتے بلکہ ان بے شمار افراد کی مساعی کی بدولت اپنی تمناؤں آرزوؤں اور خوابوں کی تعبیر پاتے ہیں جس کو انھوں نے اپنے مقناطیسی جذب دلکش سے متاثر کیا تھا۔ دنیا کی بہت سی با اقتدار ہستیوں کے لیے ان لاکھوں ابنائے وطن کا والہانہ خراج عقیدت بجا طور پر قابل رشک ہو سکتا ہے جو اس کے جنازے کے جلوس کے موقعہ پر المناک لیکن پُرشکوہ مناظر کی شکل میں ادا کیا گیا۔ یہ اس کی سب سے بڑی فتح اور اس خاکدان ارضی میں اس کی حیات جاوید کا درخشاں تاج ہے۔

(ڈاکٹر) رضی الدین صدیقی

مولوی بہادر خاں مرحوم و مغفور ایک عالم کی حیثیت سے

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ "ایک عالم کی موت دراصل عالم (دنیا) کی موت ہے۔" اس حساب سے ایک ایسے شخص کی موت جو بیک وقت عالم بھی ہو اور عارف بھی جس کا باطن بھی اس طرح منور ہو جس طرح اس کا ظاہر جاذب نظر ہو اور جس نے اپنی زندگی خلق اللہ کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہو۔ ملک و قوم کے لیے کس قدر عظیم سانحہ ہوگا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ مولوی بہادر خاں مرحوم و مغفور کی ہستی مختلف حیثیتوں سے ایک مثالی ہستی تھی۔ وہ جامع الکمالات تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کمالات سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بخل نہیں برتا اور کوتاہی نہیں کی بلکہ بے دریغ لٹاتے تھے اور لٹا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے ان کو دور سے دیکھا ہے یا کبھی کبھی ان سے ملاقات کی ہے یا محض ان کی تقریریں سنی ہیں تو ان کی زندگی کے صرف ایک پہلو سے واقف ہیں ان کی فقیہی اور بے شمار خوبیوں کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے ان کی دوستی اور رفاقت شرف حاصل کیا تھا۔ یہ حقیقت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ کسی شخص کو جتنے قریب سے دیکھا جائے اسی قدر اس کی کمزوریاں بے نقاب ہو جاتی ہیں اور یہ اصول عموماً

اکثر و بیشتر اشخاص کے لیے صحیح ثابت ہوتا ہے لیکن مرحوم اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے۔ اور ان سے قریب ترین تعلق رکھنے والے اور دن رات ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہی ان کی عظمت کے زیادہ قائل اور ان کی خوبیوں کے زیادہ معترف ہیں۔ دارالعلوم کی طالب علمی کے زمانے سے ان کی وفات تک مختلف حیثیتوں اور ہر پہلو سے سفر میں بھی اور حضر میں بھی مجھے مرحوم کو دیکھنے کا موقع ملا ہے اور میں پورے ایقان کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ مرحوم کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھتی جا رہی تھی۔ مشرق اور مغرب میں ایسی باکمال ہستیاں میری نظروں سے بہت کم گزری ہیں۔

مرحوم کی عدیم المثال خطابت ان کی اعلیٰ درجہ کی سیاستدانی اور معاملہ فہمی ان کی بے لوث اور جانباز قیادت ملک و ملت کی خدمت میں ان کا ہمہ تن انہماک اور گرانبار خلوص و ایثار یہ تمام ایسی صفات ہیں جن سے ملک کا ہر فرد ایک حد تک واقف ہے اور توقع ہے کہ مرحوم کے رفقائے کار کی کوششوں سے ان کے کارناموں پر مزید روشنی پڑے گی۔ اس موقع پر میں صرف مرحوم کی عالمانہ حیثیت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ شاید عوام اس قدر زیادہ واقف نہیں ہیں جس قدر مرحوم کے سیاسی کارناموں سے۔

مرحوم کی طالب علمانہ زندگی بہت جلد ختم ہو گئی اور ابتدائی عمر میں ہی دنیا کے دھندوں میں پھنس گئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علمی اداروں کی باضابطہ تعلیم یا امتحانوں کی کامیابی کی اسناد نہیں رکھتے تھے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ علم محض مدرسوں یا کالجوں میں حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مکتب اور ملا، انسان کی ان صلاحیتوں کو جو اکتساب علم کے لیے فطرت کی طرف سے

ودیعت کی ذاتی نقصان پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ کہتے ہیں ؎

اے کہ مدرسہ جوئی ادب و دانش ذوق
نہ خود بارہ کش از کارگہ شیشہ گراں

تاریخ عالم میں اور خصوصاً مشرق کی تاریخ میں اکثر علما نے باضابطہ مدرسوں میں نہیں بلکہ اپنی ذاتی کوششوں سے علم و فن میں کمال حاصل کیا۔ مولوی بہادر خاں مرحوم کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے فطری ذوق علم کی تشفی خود اپنے طور پر مطالعہ سے کی اور علم کی جن شاخوں سے ان کو دلچسپی تھی ان میں اس قدر طول حاصل کیا کہ باضابطہ استاد رکھنے والوں سے بدرجہا آگے بڑھ گئے۔ وہ مطالعہ کرتے تھے مشاہیر علماء سے بحث کرتے تھے اور خود غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ اکتساب علم کے یہی تین ضروری اجزا ہیں اور مرحوم ان تینوں سے بہرہ ور تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ ملک کے معدودے چند کتب خانوں میں سے ہے جن میں مختلف علوم و فنون کی معیاری اور نایاب کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے انھوں نے اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کتابوں پر جا بجا ان کے مطالعے کے نشانات موجود ہیں بلاد اسلامیہ کے سفر میں اور ہندوستان کے متعدد دوروں میں ان کی ملاقات بڑے بڑے علماء سے ہوئی اور اپنی ذکاوت اور ذہن رسا کی بدولت وہ ان علماء کی گفتگو اور بحث و مباحثہ سے بہترین استفادہ کر سکے۔ ان کی قوت فکر کا اظہار ان کی تقریروں اور علمی صحبتوں میں اچھی طرح ہوتا تھا غرض ایک عالم کے لیے جتنی ضروری صفات ہیں وہ ان میں کافی موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مختلف النوع کمالات میں ان کے علمی کمالات کو بھی جگہ دینا لازمی ہے۔

دنیائے اردو کے تو وہ سب سے بڑے خطیب تھے اس لیے ان کی اردو دانی کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی ان کی مہارت مسلمہ تھی اور تفسیر کا انھوں نے خاص طور پر مطالعہ کر لیا تھا۔ اور روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔ تفسیر اور حدیث میں ان کی معلومات جس پایہ کی تھیں اس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جو درس اقبال میں شرکت کرتے تھے۔ سچ پوچھیے تو درس میں وہ شرکت کرتے تھے اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ حاضرین ایک کیف و سرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے۔ بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر نکتے مرچ لگانا شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی تو دنیا بھر کے مختلف مسائل پیش نظر ہو جاتے اقبال کے کلام کا ایسا مطالعہ اور شاید کیا یقیناً کسی اور نے کیا ہوگا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے۔ اور درس اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے پھر اقبال کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا۔

کوئی ڈیڑھ سال قبل انھوں نے اشتراکیت اور جدید سیاسی اور معاشی نظریوں کا بغور مطالعہ شروع کیا کیونکہ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم نوجوانوں کو لادینی تحریکوں سے بچانے کے لیے ان نئی تحریکوں کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ ان نئے نظریوں کو اسلامی اصول پر جانچنے کے لیے انھوں نے ملک کے ماہرین کی تین مختلف کمیٹیاں بنائیں جن میں سے ایک کمیٹی اسلامیات کے ماہرین کی اور دوسری معاشیات اور سیاسیات کے ماہرین کی تھی تیسری کمیٹی ایسے لوگوں کی تھی جو ان دونوں کے بین بین ہوں اور دونوں

سے علیحدہ علیحدہ بحث مباحثہ کرکے ان میں ربط پیدا کریں اور دونوں کی تحریروں کا تفصیلی تجزیہ کرکے واضح طور پر یہ بتلائیں کہ جدید تحریکوں میں جو عمدہ اصول ہیں وہ بدرجہ اتم اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ خود انھوں نے بھی اس موضوع کا گہرا مطالعہ کیا اور ماہرین سے مل کر ان کے متعلق صحیح معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک پروگرام بنایا تھا کہ متعدد تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے جس میں اسلام اور اشتراکیت پر بحث کی جائے۔ چنانچہ اس موضوع پر چند لکچر انھوں نے دیئے تھے۔ ان کی تحریر بیانی پر یہ توقع تھی کہ جو نوجوان غلط فہمی کی وجہ سے ان نئی تحریکوں میں بہے جا رہے ہیں وہ اپنے اصلی مرکز پر لوٹ آجائیں گے اور اس فتنہ کا سدباب ہو جائے خود مرحوم اس اہم ترین کام کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے لیکن افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہیں کی اور انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

سید خلیل اللہ حسینی۔ ایم اے، ایل ایل بی
صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت

کیا پوچھتے ہو۔ کسے کھو دیا

مت سہل ہمیں جانو۔ پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سطح سمندر پر بارش کے بے حساب قطرے پڑتے ہیں لیکن چند ہی کے

نصیب میں رہتا ہے کہ دہنِ صدف کی زینت بنیں اور موتی بن کر چمکیں موتیاں تو پھر بھی مل جاتی ہیں لیکن وہ گہر آبدار جو حسینۂ فطرت کے حُسن کو نکھار دے کم ہی ملتے ہیں اور جب کبھی بھی ملتے ہیں دنیائے حسن کی رونق دوبالا کرتے ہیں۔

یوں تو ہر روز شاخِ گل تو جھومتی ہے کلیاں مسکراتی ہیں مرجھا جاتی ہیں نہ باغبان توجہ کرتا ہے نہ نازنینان سیر پسند لیکن کبھی کسی شاخ حیات پر دور پر پھول کھلتا ہے جو باغبان کی زندگی کا حاصل اور چمن کی آبرو بن جاتا ہے اس کا بے مثال حسن اور جانفزا رنگ سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور لگتا ہے کہ یوں تو بہار کا پیغام حیات ساری چمن کے لیے ہے مگر یہ پھول نازنین بہار کی تمناؤں کا حاصل ہے۔ فطرت کا البیلا فرزند ہے جس کے لیے خاص فطرت نے توجہ خاص صرف کی ہے، اور مصورِ فطرت نے اس کو بنا کر گویا اپنے کمال فن پر ناز کیا ہے۔

موتیوں اور گلوں کی دنیا کی طرح انسانوں میں بھی کبھی کوئی واقعی انسان کوئی باکمال ہستی اور کوئی عظیم شخصیت پیدا ہو جاتی ہے جو انسانیت کے ماتھے کا چمکتا ٹیکہ اور عروسِ انسانیت کا جھلملاتا زیور بنا۔ انسان کے گرتے مقام کو سنبھال لیتا ہے۔

بہادر خاں ایسے ہی ایک فرد تھے جو بقول سلیمان ندوی مرحوم سینکڑوں سال میں پیدا ہوتے ہیں اور جب کبھی ہوتے ہیں انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔

عام طور پر بہادر خاں لسان الامت کے خطاب سے یاد کیے جاتے ہیں ان کی خطیبانہ عظمت کا اکثر تذکرہ ہوتا رہا ہے اور بلاشبہ وہ دنیائے اردو کے فقید المثال خطیب تھے لیکن ان کی خطیبانہ بلند آہنگی نے ان کی شخصیت کو چھپا دیا۔

ان کی شعلہ نوائی نے ان کی جان پرسوز کے لیے پردہ کا کام کیا۔ لوگوں نے شمع کا نور دیکھا۔ اس کے سوز دل کا اندازہ نہیں کیا۔ جگنو کی چمک دیکھی لیکن اس عاشق وارفتہ کی جگر سوزی اور اضطرار کا راز نہ جان سکے اقبال کو شکایت تھی کہ لوگوں نے انھیں شاعر اور مغنی سمجھ لیا ہے لیکن اس پیام پر ان کی نظر نہیں گئی جو ان کی نوائے عاشقانہ کا حاصل تھی۔

بہادر خاں اگر صرف خطیب ہوتے تو اپنی ساری مشاق خطابت اور مقررانہ عظمت کے باوجود پھر بھی قائد ملت نہ ہوتے۔ اگر ان کی غیر معمولی صلاحیت کی تعریف مقصود ہے تو بلاشبہ اس میدان اجتماعی میں بھی وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ لیکن تنظیمی صلاحیت ان کی عظمت کا راز نہ تھی۔

اگر ان کی دل موہ لینے والی قدآور شخصیت کی ستائش کی جاتی ہے تو بھی بے جا ہے کہ ایک عظیم اور پُراسرار شخصیت اپنے دلربا تبسّم سے دلوں کو مٹھی میں لے لیتی ہے اور دلوں کو مسخر کرنے کا ان کا فن خوبان شہر کے لیے بھی باعث صد رشک و حسرت تھا لیکن یہ دل آویزی طبع بجائے خود عظمت بہادر خاں کی کلید نہیں ہے۔

اگر بہادر خاں کی بے پناہ جراءت کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہونا چاہیے۔ ایک مسلمان اور پھر پٹھان اگر جری نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ایک مرد خود آگاہ و خدامست بے باک نہ ہوتا تو اور کون ہوگا لیکن انسانیت تاریخ عموماً اور مسلمانوں کی تاریخ خصوصاً بہادر خاں کے تذکرے سے بھری پڑی ہے۔ جراءت کم ہوتے ہوئے بھی اتنی عام صفت ہے کہ بہادر خاں کے لیے افتخار کا طرہ نہیں بن سکتی۔

سوانح نگاروں نے ان کی غیر معمولی قوت حافظہ کی بات کہی ہے۔ بلاشبہ ان کا حافظہ بلا کا اور یادداشت غضب کی تھی لیکن یہ صلاحیت خدا کی دی ہوئی

ہوتی ہے۔ اس میں کتب کا دخل کم ہوتا ہے اس لیے وجہ ناز اور سرمایۂ افتخار نہیں ہو سکتی۔

بہادر خاں کی عظمت کا راز یہ تھا کہ وہ ایک انسان تھے انسانوں کی دنیا میں انسان تھے اور یہی بڑی غیر معمولی بات ہے۔

انسان۔ انسانیت کی ان صفات عالیہ سے عبارت ہے جن کی بناء پر "وہ حیوان ۔ ہم جسے انسان کہتے ہیں" احسن التقویم کے تاج زرنگار سے آراستہ ہوا۔ خلیفۃ اللہ فی الارض کے وہ فرمان سے مشرف ہوا اور خدا کی ساری مخلوق میں ممتاز ہو، مقربان بارگاہ الٰہی کا مسجود بنا۔

بہادر خاں کے اخلاق اتنے اعلیٰ تھے کہ لوگوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ بیسویں صدی میں صحابہ کی زندگی کا نمونہ نظر آتا تھا ان کی ملنساری اور خوش مزاجی ان کا انکسار اور خود داری لوگوں کے کام آنے کا جذبہ بے اختیار پرائی آگ میں پڑنے کا شوق والہانہ، غریبوں کی دستگیری بیواؤں کی امداد اور طالب علموں کی اعانت۔ غرض وہ اخلاق فاضلہ جن کا واسطہ دے کر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے رحمت عالم سے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے کام آتے ہیں۔ ضرورت مندوں کی دستگیری کرتے ہیں اس لیے خدا آپ کو تنہا نہ چھوڑے گا۔ ان صفات کی اس دور میں جھلک دیکھی تو محمد عربی کے اس غلام میں دیکھی جس کی آنکھیں اپنے آقا کے تذکرے پر اشکبار ہو جاتی تھیں۔

کتنے مسلمان اور غیر مسلم اصحاب نے گواہی دی کان کے آڑے وقتوں بہادر خاں نے کس کس طرح ان کی مدد کی بہت سوں کی تو اس طرح مدد کی کہ مدد پانے والے کو پتہ نہ چل سکا۔ بہادر خاں کی وفات پر سب سے اچھی نظم

کہنے والی ایک خاتون شاعر تھیں اور سب سے اچھا خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں ان کے مسلک کے شدید مخالف مسلمان یا پارسی اور ہندو لیڈر تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ان کی تقریروں پر جھومنے والے مسلمان ان کو پوری طرح سمجھ نہ سکے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک بھی کوئی ایسا خراج عقیدت نہ پیش کر سکے جو ان کے شایان شان ہوتا۔

ہاں۔ ان کو سمجھا تو طبقہ نسواں نے کہ اسے اپنی مظلومی اور محرومی کا احساس تھا اور بہادر خاں کے روپ میں انہیں ایک اللہ کا بندہ ایسا ملا تھا کہ انہیں یقین تھا کہ اللہ کے دیئے ہوئے سارے حقوق وہ ان کو دلوا کر رہے گا۔

ان کے مسلک سیاسی کے مخالف جو مسلمان تھے انھوں نے اختلاف کے طوفان میں بھی انھوں نے بہادر خاں کو ایک شریف دشمن پایا۔

پارسی طبقہ تھا جس کو یہ یقین تھا کہ بہادر خاں جیسے انسان کے ہوتے ہوئے انہیں اپنے حال اور مستقبل کی کوئی فکر نہ کرنی چاہیے۔

ہندو لیڈر تھے جو بہادر خاں سے بارہا گفتگو "مفاہمت" کر چکے تھے ان میں مسٹر نرسنگ راؤ کا تذکرہ ضروری ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ ہم دونوں تو ایک دوسرے کے ساتھ اپنا دل کھول کر رکھ دیتے تھے اور کوئی بات طے ہو جاتی تو ہمیں اعتماد رہتا کہ بہادر خاں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

گلبرگہ میں ایک مسجد سے متصل زمین کے حق ملکیت کے بارے میں ہندوؤں مسلمانوں میں نزاع پیدا ہوئی۔ ہر فریق کو اپنے حق پر اصرار تھا۔ جھگڑے نے طول کھینچا اور صورت حال کو ناگوار ہوتا دیکھ کر بعض سمجھداروں نے مشورہ دیا کہ ثالثی سے تصفیہ کرا لیا جائے۔ اتفاق دونوں فریق کا ہوا۔ بہادر خاں کو مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ

بہادر خاں مسلمانوں کے لیڈر ہیں اس لیے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کریں گے ہندو یہ سمجھتے کہ ایک سچا انسان ہے کیونکہ پکا مسلمان ہے اس لیے وہ ناانصافی نہیں کرے گا لطف کی بات یہ ہوئی کہ نواب صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوؤں کا دعویٰ درست ہے اور مسلمانوں کا غلط۔ چنانچہ انھوں نے یہی فیصلہ دے دیا۔ مسلمان ناراض ہو گئے لیکن بہادر خاں نے انھیں قرآنی ارشاد سنایا کہ کسی قوم سے مخالفت تم کو ناانصافی پر نہ ڈال دے۔ انصاف کرو کہ وہ تقویٰ سے تر ہے۔ مسلمان تو خاموش ہو گئے لیکن ہندوؤں نے سمجھا کہ ان کا اندازہ کتنا صحیح تھا کہ ایک سچے مسلمان پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ سچا مسلمان شریف انسان ہوتا ہے۔

لوگوں سے ملنے جلنے کے انداز چھوٹوں سے محبت اور بڑوں کا ادب ان مشرقی صفات کا پیکر میں تو صرف بہادر خاں کو دیکھا چھوٹوں سے شفقت کا تو میں بھی گواہ ہوں۔ میں ایک کم عمر طالب علم کی حیثیت سے درس اقبال کی محفلوں میں جاتا اور کسی کونے میں بیٹھ جاتا۔ ایک مرتبہ وہ میرے قریب آئے۔ نام پوچھا، تعلیم کے بارے میں سوال کیا اور ہمت افزائی کے چند کلمات کہے بات آئی گئی ہو گئی۔

اب اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ وہ موٹر میں جا رہے ہوں اور میں سیکل پر لیکن سلام میں پہل ہوتی۔ موٹر میں سے پہلی مرتبہ جب دارالسلام روڈ پر ایسا سابقہ ہوا تو جواب دینے میں غالباً میرے دونوں ہاتھ اٹھ گئے اور میں سیکل سے گرتا گرتا بچا۔

جن کو وہ اپنا بزرگ سمجھتے تھے ان کا احترام کس انداز سے کرتے تھے اس کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ سنا دوں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تشریف لائے ہوئے تھے۔ نظامیہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم مولانا کو دیکھنے چلے گئے۔ ہوٹل کے کمرے میں مولانا تھے۔ بہادر خاں غالباً انہیں لینے کے لیے آئے تھے اور کمرے کے باہر کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوئے گفتار کے شگفتہ پھول برسا رہے تھے۔ اس زندہ دل انسان کی گفتگو میں ایسا محو ہوگیا کہ بھول ہی گیا کہ مولانا مودودی سے ملنے آیا ہوں۔ اتنے میں مودودی صاحب تشریف لائے۔ انہیں دیکھتے ہی بہادر خاں نے اپنے ہاتھ سے سگریٹ اس طرح پھینک دیا جس طرح ہم اپنے والد کو دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں ایسی اضطراری حرکت کر بیٹھتے ہیں۔

ایک چپراسی صاحب بہادر خاں کے بڑے اعتماد کے کارکن تھے۔ ایک دفعہ جب وہ ملنے گئے اور کمرہ میں بلائے گئے تو بیچارے ٹھٹک سے گئے۔ کیونکہ اس وقت بہادر خاں سے ان کے ناظم صاحب مصروفِ تکلم تھے۔ بہادر خاں نے بات کو تاڑ لیا اور کہا کہ آپ چپراسی ہوں گے دفتر میں میرے پاس تو سب برابر ہیں بلکہ آپ تو میرے رفیق ہیں یہ کہہ کر ان کو اپنے بازو صوفہ پر بٹھا لیا۔

ایسے واقعات کا انبار لگایا جاسکتا ہے اور ایسا واقعہ بہادر خاں کی شرافت، خلوص، انسانی محبت اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیتا رہے گا۔ بہادر خاں کا مال پہاڑ کی بلند چوٹی کا سا تھا۔ دور سے دیکھو تو جاہ و جلال کا منظر، قریب ہوتے جائیے تو آنکھوں کو ٹھنڈک دل کو تراوٹ اور طبیعت کو تازگی ملتی پھر دنیا کا منظر ہی کچھ اور حسین نظر آتا۔

آج انسانوں کے ہجوم میں انسان نہیں ملتا۔ انسانوں کے روپ میں شیاطین اور درندے ملتے ہیں۔ جھوٹے، بے ایمان، ضمیر فروش، ظالم، دھوکہ باز غرض جملہ

شیطانی صفات سے متصف ایسے فرزندان ابلیس نظر آتے ہیں کہ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ نیکی و بدی کی بساط پر گویا خدا کو مات ہو گئی ہے لیکن بہادر خاں جیسے انسان جب سامنے آتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ ابھی فرزین خدا کے ہاتھ میں ہے۔

مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ بہادر کائنات کی وسیع پنہائیوں گھومتے ہوئے محض اپنی سادگی سے ہم لوگوں میں آ گئے تھے۔ وہ اس گندہ دنیا اور ذلیل انسانیت کے تکلیف دہ ماحول کے لیے موزوں نہ تھے۔ وہ ایسا گُلِ سرسبز تھے جو ایوان فطرت کے رنگ و بو میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ ان کا اس دنیا میں آنا ایسا تھا گویا اس گُلِ رنگین کو انسانیت کی مزار پر ڈال دیا گیا ہو۔

یہ مکر بھری دنیا بہادر خاں کے رہنے کے قابل نہ تھی۔ یہاں مقراط کو زہر کا پیالہ دیا جاتا ہے۔ عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا جاتا ہے۔ بالآخر اسی دنیا نے بہادر خاں کو حقہ پیش کر دیا انسان اپنی حیوانی روایت پر پورا اترا لیکن خدا کے نیک بندے سے ایسا سلوک دعویداران انسانیت کو مہنگا پڑا۔ اس کی جاگیر کیا لی ساری ریاست چھین گئی۔ ہم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے اور آج اپنی حفاظت کے خیال سے لرزاں و ترساں ہے۔

لیڈر تو ممکن ہے مل جائیں۔

آتش نوا خطیب بھی شاید پیدا ہو جائیں لیکن ایسا انسان کہاں سے آئے گا۔ مگر کہا جاتا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ رو کر یہ اعلان کرتا ہے کہ ابھی خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے۔

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید

اقبال اور قائدِ ملت بہادر خاں مرحوم

نام خدا "اہلِ شعور" کا تقاضہ ہے کہ اقبال اور قائدِ ملت کے عنوان سے خاص نمبر کے لیے کچھ سپرد قلم کروں۔ یہ حکایت لذیذ تر بھی ہے اور دراز تر ہونے کا تقاضہ بھی کرتی ہے۔ لیکن آج کل فرصتِ کار و بارِ شوق نہیں۔ اس لیے تلقین درسِ اہلِ نظر یک اشارات است۔ کے مشورہ حافظ پر عمل کے لیے مجبور و معذور ہوں۔

اگرچہ قائدِ ملت کو بعض اسباب سے یونیورسٹی کی باضابطہ اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ مل سکا لیکن ان کا دماغ فطرتاً اس کا طالب تھا اور دل اس اعلیٰ جذبہ کا حامل تھا۔ اپنی بلند فطرت کی اس پیاس کو بجھانے کے لیے انھوں نے بعض خاص ذرائع اختیار کیے تھے۔

اعلیٰ دینی علوم کی کتابیں وہ مشہور عالم و ادیب و پروفیسر مولانا شمسی صاحب مرحوم سے پڑھتے رہے حجۃ اسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ بھی انھوں نے شمسی صاحب مرحوم سے پڑھی تھی۔ مطالعہ کا انھیں بڑا ذوق تھا۔ ان کا ایک منتخب کتب خانہ تھا۔ اسی کتاب خانہ میں تفسیر، سیرت اور اقبال کی تصانیف کا ایک گنجینہ تھا۔ تفسیر کا مطالعہ خود کرتے اور اپنی دیوڑھی کے قریب کی ایک چھوٹی سی مسجد میں تفسیر درس دیتے۔ سیرت کے جلسوں ہی سے

ان کی خطابت اور اس کی مقبولیت کی بنیاد پڑی۔

ان دنوں نواب فصاحت جنگ مرحوم کی دعوت پر ان کے بنگلہ میں سیرت النبی کے ایک جلسے میں تقریر کے لیے حضرت سلیمان صاحب مرحوم مشہور سیرت نگار تشریف لائے۔ نواب بہادر یار جنگ نے پہلی ملاقات میں ان سے فرمایا کہ "میں آپ کا شاگرد ہوں" مولانا سلیمان حیران ہوئے، اتنا لمبا چوڑا اور وجیہ میرا شاگرد رہا ہو اور میں کس طرح بھول گیا۔ اس حیرت کو توڑنے کے لیے نواب صاحب مرحوم نے تشریح کی کہ میں آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے آپ کا شاگرد بنا ہوں خصوصاً سیرت پر آپ کے خطبات مدراس کے تو قائد ملت حافظ تھے۔ ہر سال مجالس سیرت کے سلسلہ میں اس کتاب کا بار بار مطالعہ فرماتے۔

اسی طرح ان کی فکر و نظر کا ایک سرچشمہ شیریں کلام اقبال تھا۔ اقبال کے کلام میں انھیں قلب و نظر کا ایک آئینہ مل گیا تھا۔ خود تصانیف اقبال بار بار پڑھتے ذوق اور حافظہ کی بدولت اکثر اشعار اقبال بر زبان تھے۔ اپنی تقریروں میں نگینوں کی طرح انھیں جڑتے

وہ بیان فرماتے کہ ایک بار لاہور گئے اور اس کی انھیں بڑی تمنا تھی کہ وہ اقبال کو شعر کہتے ہوئے حال میں دیکھیں۔ خوش قسمتی سے وہ بہت سویرے آہ سحر خیزی کے وقت جاوید منزل پہنچ گئے۔ حسب عادت اقبال تلاوت سحر کے بعد شعر کہنے میں محو تھے۔ علی بخش مرحوم کی مدد سے نواب صاحب بڑی خاموشی ان کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ اقبال اپنے شعر گوئی اور گنگنانے میں محو تھے۔ جب یہ مشغلہ ختم ہوا تو باہمی گفتگو ہوئی۔ یہ واقعہ ایک نمونہ اور علامت ہے کہ وہ اقبال اور کلام اقبال سے کس طرح دل بستگی رکھتے تھے۔

اس مطالعہ سے بھی ان کی تشنگی نہیں بجھتی تھی۔ آخر میں اہل ذوق کے مشورے سے حلقہ اقبال کی بنیاد ڈالی۔ ان دنوں جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی جمعہ کے دن عصر سے مغرب تک یہ بزم آراستہ ہوتی۔ چائے یا شربت کے دور کے بعد اس کا آغاز ہوتا۔ حیدرآباد میں بہ فضل خدا اقبال شناسوں اور ماہرین کلام اقبال ایک ممتاز و منتخب گروہ تھا۔ قائد ملت کی ذات اس کشش کا مرکز ثقل تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین رومی اور اقبال سے بڑی گہری دلچسپی رکھنے یوم اقبال کے موقع پر ایک خطبہ پڑھتے۔ اقبال موت اور حیات اقبال حضور باری میں جیسے اہم مقالات انھوں نے سپرد قلم فرمائے۔ ان کے اقبال کے موضوع پر مقالات کا شاہکار میری رائے میں اقبال کا تصور زماں و مکاں ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ روح اقبال اپنے جسمانی بدن میں لیے پھرتے تھے۔ اقبال کے عمرانی تصورات اور ادبی پہلوؤں پر اپنے مطالعہ کا نچوڑ انھوں نے روح اقبال میں پیش کیا ہے۔ سید عبدالواحد ناظم جنگلات بھی ان دنوں حیدرآباد میں تھے جنھوں نے (IQBALS ART AND THOUGHT) لکھی ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبہ فلسفہ بھی صاحب رموز اقبال ہو گئے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اقبال کے شاگرد اور کلام اقبال کے نکتہ شناس استاد تھے بعد میں فکر اقبال کے وہ مصنف ہو گئے۔ . . . . . .

. . . . لیکن آپ کی اس کتاب فکر اقبال سے بہت پہلے میں نے اقبال کے بعض اہم اور نازک پہلوؤں پر اہل فکر و نظر کے مقالات منتخب کا

ایک مجموعہ فکر اقبال کے نام سے شائع کیا تھا۔ جو اس سیریز میں تیسری کتاب تھی۔ ہم میں سے اکثر اصحاب اس ہفتہ وار بزم اقبال میں شریک ہوتے تھے۔

نواب صاحب حتی الامکان خود شرکت کی کوشش فرماتے۔ پھر تو ایک مثالی مذاکرہ اور علمی مباحثہ رہتا۔

اس حلقہ میں کلام اقبال کا مطالعہ اور فکر اقبال کے تاریخی ترتیب سے شروع ہوا۔ پہلے اسرار خودی اور رموز بے خودی کا مطالعہ تدریسی ترتیب سے انجام کو پہنچا پھر جاوید نامہ کا مکمل بالاستیعاب درسا درسا تحقیقی مطالعہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری دن بھی جاری رہا۔

اتوار کا دن تھا۔ رجب کی تیسری تاریخ تھی ظہر کے بعد محفل جمع تھی۔ اس وقت پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق زیر مطالعہ تھی۔ بیت الامت (دولت کدہ بہادر یار جنگ مرحوم) میں درس اقبال کی حکمت آموز اور دل سوز صحبت جاری تھی۔ حلقہ اقبال کے بانی اور حکمت اقبال کے شیدائی قائد ملت۔ لسان امت جن کی سراپا جہاد زندگی خود درس اور اللہ بس باقی ہوس کے مصداق اپنی ہمتی کو پر اور ہدف کو دور کرنے والی شرکت سے اس میں۔

پختہ سازد صحبتش ہر خام را
تازہ خواہد داد ایام را

کا رنگ پیدا کر رہے تھے۔ جب میں اسی مثنوی کے جلال آفرین نظم حکمت کلیمی کے اس شعر سے

و مرد حق السول ایں دیر کہن
از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

سے آگے بڑھنے لگا تو رہا یا رشید صاحب یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں۔

میں نے کہا "بہت خوب"۔
آہ کسے خبر تھی کہ یہ مردِ حق دو ایک گھنٹوں کے اندر اس دیر کہن کے افسوں کو توڑتے ہوئے یہاں سے گذر جائے گا۔ اور کلام اقبال کا یہ پیکر عمل اپنے حریفان بادہ پیما کو ؎

غیرت او برنگیرد حکم غیر
قصر سلطاں در نگاہش کہنہ دیر

کے مظاہروں سے تا قیامت محروم کر دے گا ع
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مسٹر جی راماچاری آنجہانی (قائد کانگریس)

قائد ملّت نواب بہادر یار جنگ کا ایثار

قائد ملّت نواب بہادر یار جنگ مرحوم حیدر آباد کے ایک جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کوئی باضابطہ نہیں ہوئی تھی مگر نواب صاحب کا مطالعہ اس قدر بلند اور زبردست تھا کہ ہر سیاسی معاملہ میں رائے اور فوری جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ قوت گویائی ان کی ایک خداداد بات تھی، اور کوئی شخص ان سے ملنے والا ایسا نہیں ہوگا جو ان کی شخصیت سے متاثر نہ ہو۔ ملک و مالک اور بالخصوص اپنے قوم کے لیے جو خدمات نواب صاحب نے اس تھوڑے

سے عرصہ میں انجام دیئے ہیں ان کو بھولا نہیں جاسکتا۔ آئندہ کا مورخ حیدرآباد کی تاریخ میں انہیں خاص جگہ دے گا۔

نواب بہادر یار جنگ جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے اور اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اپنے اعزازات جاگیر و منصب و اہوار سے انہوں نے جو دست برداری کی کوئی معمولی تیاگ نہیں ہے۔ نواب صاحب مرحوم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اپنے دل کی بات کو کبھی بھی پوشیدہ نہیں رکھتے تھے اور وہ اس کی پرواہ نہ کرتے تھے کہ اُس کا اظہار باعث تلخی ہوگا۔ ہماری آخری گفتگو میں جو مسائل حیدرآباد کے بارے میں مولوی ابوالحسن سید علی صاحب کے مکان پر ہوئی تھی بہت قریب قریب ہم ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن نواب صاحب مرحوم ناگپور چلے جانے کے بعد کوئی قطعی تصفیہ نہیں ہوسکا۔ نواب صاحب میرے خاص دوست تھے۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی اور انہیں اس کا موقع نہ مل سکا کہ ترقی پذیر سیاست کی راہ میں وہ ایک آل انڈیا قومی لیڈر بن سکیں جس کی اہلیت ان میں موجود تھی۔ خدا مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مولوی خلیق احمد صاحب نعمانی (عثمانیہ)

مجلس اتحاد المسلمین کی نشاۃ ثانیہ

مملکت اسلامیہ آصفیہ کے قیام میں مسلمانوں کو جو تاریخی حصہ حاصل ہوا اس کے مدنظر حیدرآباد مسلم ہندوستان کے لیے امیدوں آرزوؤں اور ہدایت کا

آباد گاہ بن گیا۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر جب غدر کی افتاد پڑی تو وہ کھچے کھچے حیدرآباد ہی چلے آئے اور یہاں کی سرکاری اور غیر سرکاری زندگی میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ حیدرآباد میں ایک مسلم سلطنت ہونے کے باوجود معاشی، مذہبی اور دیگر امور میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کے مفاد کا خیال رکھا گیا۔ مسلمانوں کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی اور انھوں نے معاشی میدان میں حصولِ مفاد کے بجائے سول اور فوجی ملازمتوں میں اپنے مقام کو محفوظ کرلیے جو ملک و مالک سے اظہارِ وفاداری اور بنی نوع انسان کی خدمت کا بہترین ذریعہ تھا اور وہ اس میں اس اصول کی بنا پر کہ "تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ عزیز رکھے۔" اس قدر منہمک ہوگئے کہ اپنی حکومت اپنے اقتدار اور اپنی اپنی فوجی قوت کے باوجود سیاسی و سماجی زندگی میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا یہی وجہ تھی کہ حیدرآباد میں سیاسی اور سماجی اداروں سے دلچسپی لی جاتی رہی اور یہ مذہبی رنگ کسی دوسرے مذہب کی تکذیب کے لیے نہیں بلکہ تمام مذاہب کے احترام کے جذبہ سے تعلق رکھتا تھا اسی ماحول میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی سربرآوردہ شخصیتوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ بین الاشتراک اور امور میں اتحاد و اتفاق کے لیے ایک مجلس قائم کی جائے۔

اتحاد المسلمین کا ماضی:۔ چنانچہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مجلس اتحاد المسلمین کی داغ بیل ۱۳۵۸ف میں بمقام توحید منزل بلدہ حیدرآباد دکن پڑی جہاں گروہ سلیمانیہ کے ایک بزرگ مولانا فتح اللہ مرحوم کی صدارت میں پہلا جلسہ

مشاورت منعقد ہوا، اس جلسہ میں مختلف گروہ اسلام کے اکابر شریک ہوئے اس مجلس کا نام "اتحاد بین المسلمین" رکھا گیا لیکن دوسرے جلسہ میں اس کو مجلس اتحاد المسلمین سے بدل دیا گیا ہے اور یہی نام اب تک چلا آرہا ہے اور حسب ذیل مقاصد قرار دیئے گئے۔

۱۔ تمام فرقہ ہائے اسلامی کو بالاشتراک امور میں بغرض تحفظ اسلام اصول اسلام کے تحت متحد و متفق کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے اقتصادی، معاشی اور تعلیمی مقاصد کا تحفظ کرنا۔

۳۔ ملک و مالک سے وفاداری اور قانون مروجہ کا احترام کرنا وغیرہ۔

اسی جلسہ میں مولانا محمود نواز خاں صاحب کو معتمد اور مولوی بشارت احمد صاحب کو نائب معتمد، مولوی میر مشہور علی صاحب کو محاسب اور مولوی محمد احمد صاحب تاجر کو خازن منتخب کیا گیا۔ ایک مجلس عاملہ تشکیل دی گئی جس میں پندرہ ارکان اعزازی کو شامل کیا گیا اس جلسہ نے تحریک اتحاد کو عامۃ المسلمین تک پہنچانے کے لیے نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی صدر الصدور وقت کی صدارت میں ۴ بہمن ۱۳۴۸ف کو ڈھائی (۲½) بجے دن جلسہ عام کیا۔ اس کے بعد مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی، مولانا آغا بندہ حسن مرحوم اور مولوی سید محمد بادشاہ حسینی صاحب کی صدارت میں متعدد جلسے ہوئے اور اس مجلس کے ذریعہ مسلمانوں کی اصلاح کا جو خیال پیدا ہوا تھا وہ حالات زمانہ کے اقتضاء سے تبدل پذیر ہوگیا مگر نگر کیرتن کے آریہ سماجی جلوس کی مقاومت کے جذبہ نے علماء کو جھنجھوڑا علماء کے وفد کی کوششوں اور نواب اکبر یار جنگ بہادر اور معتمد کوتوال و امور عامہ کی دور اندیشی سے جلوس کی اجازت نہ مل سکی مجلس کے دور اول کا یہ ایک

نمایاں واقعہ ہے ورنہ یہ مجلس بعض مواقع پر مختلف فرقہ ہائے اسلام کے علماء کو ایک اسٹیج پر جمع کرنے سے زیادہ اور کوئی کام نہ کر سکی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانہ کے حالات کا اقتضا ہی یہ تھا کہ حیدرآباد جماعتی سرگرمیوں سے آزاد رہتا۔ حقوق کا جھگڑا اتحادانہ شکایت کا موضع سرکاری میدان میں مسلمان اور معاشی میدان میں ہندو اپنے اپنے حقوق سے مطمئن اور اپنے فرائض کی سرانجامی میں مشغول تھے لیکن حیدرآباد ہندوستان کے اثرات سے بالکل بے نیاز بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

اسٹیٹ کانگریس کا قیام: اسی عرصہ میں حیدرآباد میں اسٹیٹ کانگریس کا قیام بھی عمل میں آیا اور اس کے نمائندے انڈین نیشنل کانگریس کی سالانہ میقات میں شرکت کرنے کے لیے جاتے اور بیرونی اثرات سے متاثر ہو کر حیدرآباد میں ان ہی خیالات کی ترویج کا باعث ہوتے۔ حیدرآباد میں کھادی کے فروغ کے لیے کانگریسی فنڈ سے کثیر رقم بھی دی گئی اسی طرح حیدرآباد بیرونی اثرات کو قبول کرنے لگا۔ اور دوسری طرف جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلباء میں "ذوقِ خودی" کی پرورش ہونے لگی۔ ابتداء میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اصحاب کے ساتھ کچھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا گیا۔

جمعیت رعایائے نظام: اس کے ردعمل کے طور پر ملکی تحریک کا آغاز ہوا اور جمعیت رعایا نظام کا قیام عمل میں آیا اور اس کا مسلک خانوادہ آصفجاہی سے غیر متزلزل وفاداری کے ساتھ اس ایقان کا حامل تھا کہ "حقیقت میں اصلاح نظم و نسق بے حد دقت طلب ہوگی تاوقتیکہ عاملہ (باب حکومت) کے سامنے ذمہ دارانہ ہو حقیقت میں بیرونی مداخلت اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ

(ذمہ دارانہ حکومت کا قیام) نہ ہو آج ہماری عائلہ (باب حکومت) نہ تو والی ریاست کے پاس ذمہ دار ہے اور نہ قوم کے سامنے اگر وہ کسی کے پاس ذمہ دار ہے تو وہ ممالک محروسہ کے باہر ایک تیسری جماعت کے سامنے عائلہ کو پہلے بادشاہ کے سامنے ذمہ دار ہونا چاہیے جو ہمیں یقین ہے کہ اپنی مرضی شاہانہ سے اپنی ذمہ داری کو مجلس کے حوالے کر دیگا۔ اس مسلک کو ایک گشتی مراسلہ کے ساتھ جاری کیا گیا تھا جس پر مس پدمجا نائیڈو، مسٹر ابوالحسن سید علی، مسٹر ہ رام کشن راؤ مسٹر ایس، بی شرما اور مسٹر عابد حسن کے دستخط تھے۔ اس ادارہ کا وہی حشر ہوا جو کسی ایسے ادارہ کا ہونا چاہیے تھا۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ اس تحریک کے بانیوں میں ان لوگوں کے نام لیے جاتے ہیں جو آج ذمہ دارانہ حکومت کے نظریہ کے سرے سے مخالف اور اس کے خلاف جد و جہد کے لیے مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

اتحاد المسلمین کی نشاۃ الثانیہ:۔ ایسے ماحول میں اتحاد المسلمین کی "نشاۃ الثانیہ" "مہدوی منزل" میں ہوئی مسلمانان دکن کی قیادت کا جو امتیاز تاریکی میں پڑا ہوا تھا وہ نواب بہادر یار جنگ (مولوی محمد بہادر خاں) کے حصہ میں آیا۔ اس اجتماع سے مجلس اتحاد المسلمین کی حیات نو ہوئی اور مجلس کو مسلمانان دکن کی طرف سے حق مدافعت ادا کرنا پڑا۔ حیدرآباد میں ہندوؤں کی جانب سے اولاً مطالبات پیش ہوئے۔ "ریاست حیدرآباد کی ملازمتوں میں ہندوؤں کا تناسب" کے نام سے مسٹر ایل این پھاٹک نے پمفلٹ تقسیم کیے اور ملازمتوں کی فرقہ وارانہ تقسیم کی تحریک شروع ہوئی اور اس کے جواب میں مسٹر سید محمد احسن کے نام سے (پمفلٹ) کی اشاعت عمل میں آئی

دوسری طرف مجلس اتحاد المسلمین کی جانب سے مجلس کے دوسرے منتخب معتمد مولوی ابوالبیان خواجہ بہاؤالدین صاحب نے "عرض حال" صدر اعظم بہادر ارباب حکومت سرکار عالی کی خدمت میں پیش کیا جو "فرقہ واری مطالبات کا مسکت جواب" ہے۔

اس ماحول میں مجلس نے مسلمانوں کی اس قدر موثر رہنمائی کی کہ اسے مسلمانوں کی واحد جماعت بننے کا شرف حاصل ہوگیا۔ اس سال مجلس نے مدافعت کے علاوہ تنظیم و اصلاح اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے یادگار جلسہ لیا۔

سال زیر رپورٹ میں علاوہ ۱۲ر آذر ۱۳۴۷ف کے جلسہ عام کے جس میں اراکین عاملہ منتخب کیے گئے ایک جلسہ عام بتاریخ ۱۳ر فروری ۱۳۴۸ف منعقد ہوا جس میں دستور العمل مجلس کی ترمیم کی گئی موخر الذکر جلسہ عام میں یہ بھی طے ہوا کہ محرم ۱۳۵۷ف کے عشرہ اول کو بطور عشرہ اتحاد المسلمین منایا جائے اور کوشش کی جائے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کا کوئی مسلمان رکنیت مجلس سے خارج نہ رہ جائے۔ سال زیر رپورٹ (دور ابوالبیان) میں کل تیرہ اجلاس ہائے معمولی طلب کیے گئے جن کے منجملہ صرف ایک جلسہ منعقدہ ۱۰ر آذر ۱۳۴۷ف بوجہ عدم تکمیل نصاب برخاست کیا گیا۔ اجلاس ہائے عاملہ میں جو اہم مواد پیش ہوئے یا طے پائے وہی اس رپورٹ کی اصل ہیں اور ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

آئینگار کمیٹی اور مجلس کی یادداشت:۔ جدید مجلس کے سامنے جو سب سے پہلا سوال پیش ہوا وہ اصلاحات دستوری اور آئینگار کمیٹی

سے متعلق تھا۔ مجلس نے اس کمیٹی کی اہمیت کو بہ دقت اول پہچانا اور ایک ذیلی کمیٹی اس غرض کے لیے منتخب کی کہ دستوری اصلاحات کے مسئلہ پر نواب سر صدر اعظم بہادر کی تقریر بابتہ ۱۷ آبان ۱۳۴۶ف کی روشنی میں غور کر کے رپورٹ پیش کرے اور اس کو اختیار دیا گیا تھا کہ ملک کے دوسرے اصحاب فکر و نظر سے بھی اس مسئلہ میں مشورہ کرے۔ سب کمیٹی کی تجاویز جب مجلس عاملہ میں پیش ہوئیں تو مناسب سمجھا گیا کہ تمام اضلاع ممالک محروسہ سے نمائندگان کو طلب کر کے ان سے مشورت کی جائے اور اس مشورت کی روشنی میں مجلس عاملہ اپنی پالیسی طے کرے چنانچہ بتاریخ ۱۴ بہمن ۱۳۴۷ف تمام اضلاع کے نمائندگان کا ایک جلسہ طلب کیا گیا مجلس اس امر پر مسرت کا اظہار کرتی ہے کہ تمام اضلاع نے مجلس کی دعوت قبول کی اور اپنے نمائندے روانہ کیے جنھوں نے مسلسل آٹھ گھنٹوں کی نشست میں اس مسئلہ پر بلدہ کے تمام اہل فکر کے ساتھ غور کیا۔ دستوری اصلاحات کے سلسلہ میں مجلس عاملہ نے بلدہ کی دیگر اسلامی انجمنوں اور اداروں سے بھی اشتراک عمل کی خواہش کی چنانچہ تقریباً تمام اداروں نے جلسہ مشاورت میں حصہ لیا اور اپنی اپنی انجمن کی طرف سے اعلان کیا کہ وہ صدر مجلس اتحاد المسلمین کی تجاویز سے متفق ہیں اور اس کو اپنا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ صدر مجلس عاملہ نے سب کمیٹی اور جلسہ مشاورت کی تجاویز پر تین مسلسل اجلاسوں میں غور کیا اور اپنی یادداشت اندرون مدت آئندہ کمیٹی میں پیش کر دی جو ملک کے تمام وفادار طبقوں کے جذبات کی صحیح ترجمان ہے۔

لائحہ عمل :۔ صدر مجلس نے اپنی تمام شاخوں کے لیے ایک مفصل

لائحہ عمل مرتب کیا تاکہ وہ اس کے مطابق عمل پیرا ہوں اور مسلمانوں کی اصلاح تنظیم کریں یہ لائحہ عمل شائع کر کے معتمد صاحبان شاخ ہائے مجلس کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا اور اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اگر ہماری شاخوں نے اس کی تمام سفارشوں پر کما حقہ عمل کیا تو مسلمانانِ دکن کی ساری مصیبتیں راحت سے بدل سکتی ہیں اور ان کے سارے اندیشے رفع ہو سکتے ہیں۔

توقیر ارکان:۔ اجلاس عام منعقدہ ۱۳ر فروری ۴۷ء میں طے ہوا تھا کہ توقیر ارکان کے لیے محرم عشرہ اول کو بطور عشرۂ اتحاد المسلمین منایا جائے اور مجلس عاملہ منعقدہ ۲۷ر فروری ۴۷ء نے بھی اس کی توثیق کی تھی اس لیے ارکان مجلس عاملہ نے بطور خاص اس کی سعی کی، الحمد للہ کہ اس کے بہت اچھے نتائج مرتب ہوئے، بلدہ اور اضلاع میں ہزارہا مسلمانوں نے مجلس کی رکنیت قبول کی اور کہا جا سکتا ہے کہ جن جن مقامات پر مجلس کی شاخیں ہیں وہاں بہت کم ایسے مسلمان ہوں گے جو مجلس کی رکنیت سے محروم ہوں صحیح تعداد ارکان تمام شاخوں سے طلب کی گئی ہے۔

اضلاعوں میں شاخوں کا قیام:۔ توقیر ارکان و قیام شاخہائے مجلس و اصلاح و تنظیم اور بعض شکایات کی تحقیقات کے سلسلہ میں ارکان مجلس عاملہ کی خواہش پر ذاتی اخراجات سے دورے کے لیے تمام مقامات پر مجلس کی جدید شاخیں قائم کیں۔ قائد ملت نے اپنے ذاتی صرفہ سے دس سے زائد اضلاع اور اس کے تعلقات کے تفصیلی دورے کیے جہاں شاخیں موجود نہ تھیں وہاں وہاں شاخیں بنائیں اور جہاں شاخیں تھیں ان کو برسر کار لانے کی سعی کی یہاں تک کہ خورداد ۴۷ء میں منجانب حکومت قائد ملت کو دوروں اور تقریروں

سے منع کر دیا گیا، اس طرح بلدہ و اضلاع اور قصبات کے مسلمان اپنے ہر دلعزیز قائد کے زرین خیالات کے استفادہ سے محروم کر دیے گئے۔ ..... وغیرہ۔

جمعیت رضا کاران:۔ صدر مجلس ہائے نے بہ اغراض مجلس اپنی ہر شاخ کے ساتھ ایک جمعیت رضا کارانہ کی ضرورت محسوس فرمائی اور اس کے قواعد ترتیب اور جمعیت کی تنظیم کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی جس کے ارکان قائد ملت، مولانا محمود نواز خاں صاحب، مولوی ولی اللہ حسینی صاحب اور مولوی ابوالبیان خواجہ بہاؤ الدین صاحب ہیں کئی شاخوں نے جمعیتیں قائم کر لیں۔

مجلس مدافعت کی تشکیل:۔ ایک بااختیار سب کمیٹی نے خورداد ۴۷ف کے بعد سے آذر ۴۷ف تک اسی کا التزام رکھا کہ حتی الامکان ہر ہفتہ میں تین دفعہ یعنی شنبہ، سہ شنبہ اور پنجشنبہ کو اپنے اجلاس کرتی رہی اس نے بہ قدر ضرورت اپنے لیے سرمایہ بھی جمع کیا اور ان تمام ضروریات میں صرف کیا جو تحفظ حقوق مسلمانان کے لیے ضروری تھے۔ اس سلسلہ میں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ حکومت نے زرعی مقروضیت کے ارتفاع کے لیے اس عرصہ میں جو چند قوانین نافذ کیے ان کے منجملہ دستور العمل انتقالی اراضی سے مسلمانوں کے بعض اہم گروہوں کو غیر محفوظ قرار دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شدید معاشی نقصان کا اندیشہ ہے۔ صدر مجلس نے نہ صرف اس مسئلہ کی طرف حکومت کو شدت سے متوجہ کیا بلکہ دستور العمل قرضہ دہندگان اور دستور العمل مصالحت قرضہ سے متعلق بھی بعض مفید ترمیمات حکومت کی خدمت میں پیش کیں۔

مجلس کی مرکزیت:۔ مجلس نے نواب بہادر یار جنگ بہادر کی

قیادت میں مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے جو خدمت انجام دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مولوی ابوالحسن سید علی صاحب جیسے قوم پرستوں کو اپنا مقام اس مجلس میں تلاش کرنا پڑا یوں تو مولوی ابوالحسن آریہ سماجی ہنگامہ آرائی کے زمانہ سے مجلس سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن باضابطہ تعلق ۴۸ء سے ہوا جب کہ آپ نے اتحاد المسلمین کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی اور رکن عاملہ منتخب ہوئے اس کے بعد زمانہ کے اقتضا کے لحاظ سے مجلس کو عام مسلمانوں اور زیادہ خاص مسلمانوں سے ربط ہو گیا تھا اور بعض حلقوں میں ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک وجیہ معتمد کو منتخب کیا جائے اس لیے مولوی صاحب دو مقابل امیدواروں کے مقابلہ میں معتمد منتخب ہوئے مولوی صاحب کے زمانہ معتمدی کو ہم "دور ابوالحسن" کا نام دیتے ہیں جس کا ان ہی کی زبانی اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ "مجلس عاملہ نے سال زیر رپورٹ میں بارہ جلسے معمولی اور نو غیر معمولی منعقد کیے مجلس عاملہ نے چونکہ بہت سے اہم معاملات کو مجلس قائمہ کے سپرد فرمایا تھا۔ اس لیے مجلس عاملہ نے کاروبار کا بہت بڑا حصہ مجلس قائمہ نے انجام دیا۔ مجلس قائمہ کے کل اجلاس تیس ہوئے سال زیر رپورٹ کے اوائل میں مجلس نے اپنے منتخب شدہ ارکان عاملہ کے مختلف کمیٹیاں تقسیم کار کی اغراض کے لیے بنا دی تھیں۔ مجلس کی شاخوں میں بمقابل سال گذشتہ (۱۱۴) کا اضافہ ہوا' اس طرح (۱۷۲) جملہ تعداد رہی سال زیر رپورٹ تک بھی صورت حال یہ رہی کہ باوجود مجلس کی ہر دلعزیزی اور شاخوں کی زیادتی کے ضلعواری تنظیم کافی طور پر نہ کامیاب ہوئی اس لیے صدر مجلس کو تقریباً

ہر چھوٹی مجلس سے راست مراسلت کرنی پڑی۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اضلاع کی مجالس بوجہ اپنے سرمایہ کی کمی اور دفتری تنظیم کے فقدان کے اپنے تحت ابتدائی مجالس کو جو تعلقات و قصبات میں قائم ہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ یقین و اعتماد ہے کہ آئندہ سال ہماری مجالس اضلاع اپنی تنظیمی کیفیت کو کافی ترقی دے سکیں گی اور اپنی تحت کی مجالس موثر طریقہ پر ربط پیدا کر لیں گی اس طرح صدر مجلس پر جو مراسلت اور کاروباری بار ہے اس کو ہلکا کر سکیں گے۔ علاوہ پندرہ اضلاع کے تعلقات عالیہ ولاتور کی مجالس کے بلحاظ آبادی ضلع کا درجہ دیا گیا۔

دورِ صدارت :۔ مولوی ابوالحسن کی معتمدی کے بعد ایک جدید دور شروع ہوتا ہے جس کو "دورِ صدارت" کہنا چاہیے کیونکہ اب جدید دستور کے تحت پوری کابینہ صدر کی نامزد شدہ ہوتی ہے اس جدید دور سے پہلے صدر قائد ملت اور پہلے معتمد مولوی محمد عبدالرؤف صاحب ہیں پہلے بھی قیادت و صدارت موجود تھی لیکن دستوری نہ تھی رؤف صاحب کا دور اس حیثیت سے ایک اہم دور رہا ہے کہ اصلاحات کی مہم اور سخت اقدام کے بعد ردعمل کا مجالس کو مقابلہ کرنا پڑا اور جدید دستور کے تحت جدید بنیادوں پر مجلس کو سارے ممالک محروسہ کی تنظیم کی مسافت طے کرنی پڑی۔ دورِ ابوالحسن اگر اقدام کا دور تھا تو رؤف کا دور اس اقدام کو طے کرنے تصفیے اور فیصلے کرنے کا دور تھا جس میں عوام کی قوت سے زیادہ مجلس کی کابینہ کے دل و دماغ کو پوری طرح مصروف رہنا پڑا۔ غرض قائد ملت کا دورِ صدارت اور رؤف کی معتمدی کی حیثیتوں سے ایک عہد آفرین دور کا آغاز تھا جس میں ذہن و کردار کا امتحان بھی

تھا۔ قوتوں کی آزمائش اور مستقبل کے فیصلوں کا مطالبہ بھی۔

رؤف کے بعد مولوی یامین زبیری صاحب معتمد منتخب ہوئے جو قائد ملت کے حسب ہدایت فرائض انجام دیتے رہے اور اب بھی معتمد برقرار ہیں۔

کسے خبر تھی کہ قائد ملت اچانک ہم سے چھین لیے جائیں گے اور ملت اسلامیہ دکن کی کشتی ساحل مراد سے قریب ہوتے ہوئے بھی ساحل کو تکتے رہے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

از:۔ مسٹر وینکٹ راؤ آنجہانی
(قائد کانگریس)

قائدِ ملّت

"قائد ملت کی بھی تقریر ہوگی"۔ لسان الامت تقریر فرمائیں گے"۔ الحاج بہادر خاں صاحب اشتراکیت اور اسلام پر تقریر کریں گے"۔ جب کبھی کوئی اعلان کوئی اشتہار یا کوئی خبر ان جلوں کے ساتھ شائع ہوتی تو ناممکن تھا کہ کوئی مسلمان اسے پڑھتا اور خود اس جلسہ میں شرکت کا ارادہ نہ کر لیتا۔ اس سے قبل متعدد بار قائد ملت کی زبان سے تقریر سن چکے ہیں مگر ہر دفعہ ایک نیا ہی لطف ہر مرتبہ ایک خاص مزہ کبھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ تشنگی شوق کا یہ عالم کہ بجھائے نہیں بجھتی۔ تقریر میں ایک جادو تھا ایک سحر تھا ایک افسوں تھا جو ہزارہا عقیدت مندوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے مگر عوام اسے

باران رحمت سمجھے ہوئے بھیگ رہے ہیں لیکن قائد کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی بغیر سنے جا نہیں سکتے۔ کڑاکے دار دھوپ چمک رہی ہے پسینہ بہہ رہا ہے، پیر جل رہے ہیں تقریر کے لطف کے سامنے ہوا یہ تکالیف کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ رات میں وہ چاند بنتے تو عوام ہالہ کی مانند حلقہ بگوش ہو جاتے، وہ شمع محفل بنتے اور عوام پروانہ وار ان پر جان فدا کرنے آتے۔ یہاں وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

سحر خطابت کا یہ عالم کہ کبھی دیپک راگ کی طرح مجمع میں آواز کی آگ لگا دی اور کبھی ملہار راگ کی طرح اگر مصنوعی جوش ہوتا تو ٹھنڈا کر دیا۔ کبھی مجمع گلستان بنا ہوا ہنس رہا ہے تو کبھی خاموشی کا یہ عالم کہ سوئی گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تقریر سیاسی ہو یا مذہبی عوام اس جدید ڈیما سیتھنز کی زریں آواز سننے دیوانہ وار آتے۔ مذہبی تقریر کی تو خسرو دکن سے "بہادر یار جنگ" کا خطاب پایا، سیاسی تقریر کی تو مجمع نے قائد ملت کا خطاب دیا" کوئی جلسہ بغیر لسان الامت کے کامیاب نہ ہوتا اور عوام تقریر سے کئی گھنٹے پہلے ہی آجاتے تاکہ موزوں جگہ مل جائے وقت مقررہ پر عوام کا محبوب قائد تقریر کرنے اٹھ کھڑا ہوتا تو فلک شگاف تالیاں اس کا استقبال کرتیں۔ نیند کے ماتے ہوشیار ہو جاتے، اونگھنے والے بیدار ہو جاتے ہر شخص امیر ہو یا غریب، بچہ ہو یا ضعیف اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ جاتا "سنو سنو نواب صاحب تقریر کر رہے ہیں۔" ہر ایک دوسرے سے کہتا صاحب "گنج ہائے

گراں مایہ کے الفاظ ہیں" کس بلا کے بولنے والے تھے بولے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانہ میں توپیں ڈھلنے والی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ اردو زبان بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرحوم کے گھر کی باندی بنی ہوئی تھی۔ استعارات، تشبیہ، موزوں اشعار کا دریا تھا کہ بہا جاتا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے پردے میں کوئی اور طاقت ان سے سب کچھ کہلوا رہی ہے۔ ایک لفظ جو استعمال کرتے کبھی دوسری دفعہ وہ شاید ہی وہ استعمال ہوتا بعض بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ بغیر کسی تیاری کے کھڑے ہو گئے لیکن تقریر کی تو ایسی کہ اگر کوئی کئی دن کی تیاری کے بعد بھی آتا تو اس سے بہتر تقریر نہ کر سکتا تھا۔ فضاء "اللہ اکبر" اور قائد ملت زندہ باد"، "شاہ دکن زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھتی۔

تقریر سننے کے بعد ہر شخص یہ محسوس کرتا کہ علم و ادب فکر و نظر تفکر و خیال کا ایک بیش بہا خزانہ اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے۔ اتحاد و تنظیم یہ دو ایسے الفاظ ہیں جن پر عوام کو عمل کرنے کے لیے مجبور کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن سحر خطابت کی بناء پر عمل پیرا ہونے کے لیے مجبور ہو جاتا موت سے برسر جنگ ہونا انھوں نے سکھایا مسلمان کی حقیقی کیا شان ہے انھوں نے مسلمانوں کو بتلائی اقبال کے مرد مومن اور شاہین کی وہ خود عملی تصویر تھے۔ عوام تاریکی میں تھے، انھوں نے خضر راہ بن کر ان کی قیادت کی، ان کا جہاز بھنور میں پھنسا ہوا ڈگمگا رہا تھا مرحوم نے ناخدا بن کر قیادت کی مگر وائے بدقسمتی ؎

قسمت تو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے

قائد ملت کو اگر "ضیغم اسلام" کا خطاب بھی دیا جاتا تو نہ بجھ جاتا سرخ و سپید رنگ، بھاری بھرکم جسم نورانی چہرہ خوبصورت ڈاڑھی چمکدار آنکھیں جس میں محبت، ملاحت، ذہانت، ذکاوت کی جھلک تھی۔

اک نظر جسے دیکھا اسے رام کیا، ہنستے تو دل موہ لیتے بات کرتے تو خلوص کا یہ عالم کہ ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی فرشتہ سچ مچ انسان کے بھیس میں زمین پر آگیا ہزاروں بیوائیں، سینکڑوں یتیم، بیکسوں بے نوا بربادان کی سرپرستی میں روٹی کھا رہے تھے۔ آہ ان کا اب کیا ہوگا!

کیا ہوگا!!

اقبال مرحوم نے کہا تھا "برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر" اور یہ کہہ کر قدرت کا ایک راز افشا کر دیا تھا مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، سر اقبال مرحوم سب ایک ایک کر کے اٹھ گئے اور داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے مسلمانوں کو مرحوم کی بے وقت موت دعوت فکر و عمل دیتی ہے کہ اسباب و عمل پر غور کریں جن کی بنا پر قدرت ان کے ساتھ یہ عمل کر رہی ہے۔

رشید احمد صدیقی صاحب کے الفاظ ہیں۔ قائد ملت کی موت کا حال سنا تو رہ رہ کر خیال آتا رہا کہ مرحوم کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا فرد موت پر کیا گزری ہوگی۔ ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے کیا نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اسی لیے بنائے گئے ہیں فتح و شکست ہوتی رہے لیکن جنگجو کہاں ہے، شہادت کس کو نصیب ہوگی۔

ایسا حسین کہاں جس کی خود یزید کو تلاش ہو
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

نواب بہادر یار جنگ کی خطابت اور شخصیت کے چند پہلو

نواب بہادر یار جنگ ایک ممتاز اور با اثر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ پھر دار العلوم میں شریک ہوئے لیکن وہ میٹرک کی تکمیل بھی نہ کر سکے۔ مدرسہ کے زمانہ میں بھی میلاد النبی کے جلسوں اور دوسری تحریکوں سے ان کو پڑھنے کی نسبت زیادہ دلچسپی رہتی۔ مذہب سے ان کو بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ دینیات اختیاری مضمون لیا تھا۔ انھوں نے مدرسہ کی تعلیم ترک کرنے کے بعد ذاتی مطالعہ سے اپنی معلومات میں اضافہ کیا اردو، فارسی اور عربی میں دستگاہ پیدا کی۔ حدیث، منطق، کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ انگریزی خاصی بول لیتے تھے۔ البتہ لکھنے میں کچھ تکلف ہوتا تھا۔ آخر عمر تک وہ اپنے مطالعہ میں وسعت دیتے رہے اور انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی مشق بھی جاری رکھی۔ وہ فصیح اردو بولتے تھے مہاراجہ کشن پرشاد نے ایک دفعہ ان سے دریافت کیا کہ نواب آپ نے اردو کہاں سیکھی۔ نواب صاحب نے جواب دیا شرر سے۔ مہاراجہ نے پوچھا کیا اس وقت جب کہ وہ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ اس وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر پوچھا کیا اس وقت جب وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے جواب دیا انھوں نے لکھنؤ دیکھا بھی نہیں تھا۔ مہاراجہ نے بڑے اچنبھے سے پوچھا پھر آپ نے

ان سے اردو کیسے سیکھی۔ نواب صاحب نے کہا ان کے ناولوں کے مطالعہ سے۔
ابتدائی زمانہ میں جب ہندوستان کے طول و عرض میں قومی تحریک نے زور پکڑا ترک موالات اور خلافت جیسی تحریکیں ابھریں تو نواب صاحب نے اپنے ایک دوست نصیر جنگ کے بڑے صاحبزادے کے ساتھ مل کر حیدرآباد میں چندہ جمع کیا۔ جاگیردار گھرانوں کے ان دونوں نوجوانوں کا اس عہد کے حیدرآباد میں چندہ جمع کرنا بڑی غیر متوقع بات تھی کہتے تھے کہ اس زمانہ میں کھدر بھی پہنتے تھے لیکن ان کا یہ رنگ بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا۔ بہت جلد میلاد النبی کے جلسوں اور دوسری سماجی اصلاحی تحریکوں پر ان کی توجہ ہوئی۔ بیواؤں کے نکاح ثانی پر بے شمار تقریریں کیں۔ جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم بے جا اسراف جیسی بے شمار باتوں کے خلاف مہمیں چلائیں۔ ان کی ابتدائی تقریریں زیادہ تر میلاد النبی کے جلسوں اور سماجی اور اصلاحی تحریکوں پر ہوا کرتی تھیں۔ غالباً انھوں نے سماجی اصلاحی تحریکوں کے لیے ایک انجمن بھی قائم کی تھی۔ ان کے میلاد النبی کے جلسوں کی دلچسپی آخر دم تک برقرار رہی۔

میں ابھی عثمانیہ یونیورسٹی کے پہلے سال میں ہی تھا کہ مجھے فن تقریر کی کسی انگریزی کتاب کا بوسیدہ سا اردو ترجمہ ملا انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کو یہ نسخہ بھیجا اور خواہش کی کہ اسے مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ میں نے یہ کام پورا کیا تو مجھے اس کتاب میں چند باتوں کی کمی نظر آئی۔ پھر ایک کتاب خطابت کے عنوان سے تصنیف کی اس میں نہ صرف فن خطابت کی مختلف شقوں سے بحث کی گئی تھی بلکہ اردو کے مشہور مقررین پر بھی لکھا گیا تھا۔ انجمنوں کے دستوری نظام سے متعلق بھی مواد فراہم کر دیا گیا تھا تاکہ طالب علم کو جمہوری نظام حکومت میں

انجمنوں اور پبلک اداروں کے کام کس طرح ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ ہو سکے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں اصناف تقریر، اردو مقرروں پر تبصرہ اور بحث و مباحثہ کی انجمنوں سے متعلق مواد فراہم کر دیا گیا تھا۔ اس میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریری خصوصیتوں پر بھی ایک باب لکھا گیا تھا۔ اس کا مقدمہ نواب صاحب نے لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں "مجھے اس بات کا ہمیشہ ملال رہا ہے کہ فن تقریر جیسے ضروری اور اجتماعی زندگی کے لیے لازمی فن پر اچھی کتابیں نہیں ملتیں کوئی شک نہیں کہ تقریر کا ملکہ قدرت کی عطا ہے لیکن چند خاص ضابطوں پر عمل کرنے سے اس ملکہ کو ترقی دی جا سکتی ہے اور تقریر میں زیادہ جاذبیت اور اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اس وقت فن تقریر پر بعض کتابیں پڑھیں جب میری تقریریں خاصی مقبول ہو چکی تھیں اور میرے اپنے تجربے نے اس فن کے چند اصول مرتب کر لیے تھے۔ پھر بھی مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ پہنچا۔

نواب صاحب نے میرے بارے میں لکھا تھا "انھوں نے مجھ سے پہلی دفعہ ملاقات کی تو ان کی ذہانت، سنجیدگی اور معاملہ فہمی نے مجھے متاثر کیا تھا اور آج میں اپنے تاثر کو زیادہ پختہ محسوس کر رہا ہوں، اور ان کے مستقبل کی درخشانی کا یقین رکھتا ہوں۔" میں نے اس کتاب میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریری خصوصیتوں کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کا اقتباس یہ ہے۔

"نواب صاحب عصر حاضر کے ایک نہایت ہی فصیح اور پر اثر مقرر ہیں جن کی قوت اظہار سیاستدانی اور موجودہ طرز حکومت کی وضاحت کا شہرہ مسلم ہو چکا ہے۔ ان کی تقریری تربیت دوسرے طالب علموں کے ساتھ مدرسہ کی بزم مباحثہ

میں ہوئی۔ انھوں نے سب پر سبقت حاصل کی اور تقریری مسابقت میں اول آنے کے صلہ میں طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔"

ان کی تقریر کے جوہر میلاد النبی کے جلسوں میں کھلے۔ ایک بار خسرو دکن بھی شریک محفل تھے۔ آپ نے نواب صاحب کی تقریر کو بے حد پسند فرمایا اور خطاب عطا فرمایا۔ ان کی رگ و ریشہ میں ملک و قوم کی محبت سمائی ہوئی ہے جس کا ان کی تقریروں سے اظہار ہوتا رہتا ہے۔ عام مقرروں کی طرح تباہیوں پر آنسو نہیں بہاتے بلکہ اس کی غیرت اور حمیت کو اپنی جادو بھری تقریر سے بیدار کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ وہ دوسری قوموں کے دوش بدوش میدان ترقی میں گامزن ہو جائیں۔ ان کی تقریروں میں انتہا درجہ کے ترقی پسندانہ جذبات ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا نوجوان تقریر کر رہا ہے جس کے سامنے ایک بلند مقصد ہے جس تک وہ اپنی قوم کو لے جانا چاہتا ہے۔ نواب صاحب کی تقریروں میں مولانا ابوالکلام کا زور بیان مولانا محمد علی کا استدلال اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی دلکشی کا امتزاج ہے جس سے ایک انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ زبان میں بلا کی سلاست و روانی ہے۔ اپنی موزوں و موثر آواز سے تقریروں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ فارسی اور عربی زبان کی چاشنی سے اثر آفرینی میں بڑی حد تک مدد و معاون ہوتی ہے۔ یہ اسلامی تاریخ منطق اور علم کلام سے بخوبی واقف ہیں اور اقتضائے زمانہ نے ان کو سیاست کی جدید تحریکات سے بھی کافی روشناس کرا دیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ ان کا خطاب دل سے ہوتا ہے اور ہر چیز کا فیصلہ دماغی پیچیدگیوں سے غیر متاثر رہ کر کرنا چاہتے ہیں۔ تقریر بہت معلومات آفریں ہوتی ہے لیکن اس قدر سلجھا ہوا اور دلکش انداز بیان ہوتا ہے کہ سامعین

پر بار نہیں گزرتا اور نہایت شوق اور انہماک سے تقریر سنتے ہیں۔ تقریریں سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضمون پر کافی غور و خوض کرتے ہیں اور ایک ذہنی خاکہ تیار کر کے اسی کے مطابق تقریر کرتے ہیں جس کی وجہ سے تسلسل قائم رہتا ہے۔ ہر سرخی کے تحت کافی معلومات نہایت ہی پر لطف اور موثر انداز میں پیش کرتے ہیں، تقریر کے اختتام پر اس کا اقتباس بھی دیتے ہیں۔

خاکہ کی رنگ آمیزی میں جہاں علمی اور ٹھوس معلومات فراہم کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی مثالیں اور اسی قسم کی دوسری ایسی باتوں سے مدد لیتے ہیں جو عوام کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تقریریں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی پڑھے لکھے کے لیے یکساں دلچسپ ہوتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی لکھا تھا "علم و بردباری کا یہ عالم ہے کہ سخت سے سخت تنقید کو بھی خندہ پیشانی سے . . . . سنتے ہیں، اور تنقید حقیقت پر مبنی ہوتی ہے تو انہیں اسے قبول کرنے میں عذر نہیں ہوتا۔"

میں نے یہ اقتباس ذرا تفصیل سے اس لیے دیا ہے کہ یہ نواب صاحب کی شخصیت کا بہت اہم پہلو ہے اور یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھی اور اس کا انھوں نے خود بھی مطالعہ کیا تھا اس لیے یہ سمجھنا کہ میرے ان خیالات سے واقف اور آگاہ تھے درست ہے۔ میں آج سوچتا ہوں کہ میں نے جو رائے نواب صاحب کی تقریر کے بارے میں دی تھی اس میں اصلاح اور تبدیلی کی کس حد تک گنجائش ہے۔ یہ کتاب آج سے کوئی چوبیس سال پہلے چھپی تھی اور اس وقت میں انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال میں پڑھتا تھا۔ اس دوران میں مجھے دنیا کے نامور مقررین کی تقریریں سننے اور بین قومی مجلسوں میں شریک ہونے اور

بیرونی ممالک کے جمہوری اداروں میں حصہ لینے کا موقع ملا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نواب صاحب خطابت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے نامور مقررین کی صف میں بہ آسانی شریک کیے جا سکتے ہیں۔ اکثر ان کی تقریروں میں خطابت کا عنصر زیادہ تھا۔ وہ بحث و مباحثہ اور پارلیمانی طرز کی تقریروں کے فن سے زیادہ واقف نہیں ہوئے تھے۔ یوں تو مجلس وضع قوانین کے رکن تھے اور تقریریں بھی کی تھیں لیکن ان کا وہ خطیبانہ انداز بیان ہر موقعہ پر قائم رہتا تھا۔ میلاد النبی کے جلسوں میں ان کی تقریروں کے جوہر ایسے کھلے کہ انھیں فن خطابت کا غیر معمولی اعتماد پیدا ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ مقرر کی خطیبانہ مہارت میں دلکشی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب وہ ایک پر اثر اور باوقار شخصیت کا مالک ہو، اور خلوص، بیباکی اور سچے جذبات رکھتا ہو۔ نواب صاحب میں یہ سب باتیں تھیں۔ وہ ایک باوقار شخصیت کے مالک بھی تھے اور خلوص و بے باکی اور سچے جذبات کی دولت سے مالا مال بھی تھے۔ انھیں باتوں نے ان کی تقریروں میں جادو اثری پیدا کر دی تھی۔ وہ سماع بھی خوب باندھتے تھے۔ کبھی کبھی کسی واقعہ کو دلچسپ بنانے کے لیے اس کے ماحول کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے تھے۔ گریز کے بھی وہ استاد تھے۔ لوگوں کی نفسیات بھی خوب جانتے تھے۔ چاروں طرف مجمع پر ان کی نظر رہتی تھی اور اس بات کا خوب خیال رکھتے تھے کہ ان کی تقریر کیا اثرات مرتب کر رہی ہے۔ بیان کی رنگینی یقین کی فراوانی خلوص اور سچے جذبات کی موجودگی سے ان کی تقریروں میں جان پڑ جاتی تھی۔ آج بھی میں سوچتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نواب صاحب کی تقریروں

کے بارے میں، میں نے جو رائے ظاہر کی تھی اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ تفصیل سے لکھا جا سکتا ہے۔ مختصر میں نے ان کی تقریر کے ہر پہلو کا ذکر کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری کا خوب سہارا لیتے تھے۔ رومی کو بھی پڑھا تھا۔ زبان سلیس اور شستہ تشبیہ، استعارے کنایہ امثال اور کہاوتیں بھی خوب استعمال کرتے تھے۔ نواب صاحب اس بات کی بھی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے کہ نیا سے نیا مضمون تھوڑا بہت پڑھ کر اسی طرح اپنا لیتے تھے کہ گویا ملکہ رکھتے ہوں۔ توجہ اور غور و خوص کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی قلبی انکشاف بھی ہو جاتا تھا اور مضمون کے اجمال کی تفصیل بیان کرنے میں احوال و واقعات کا سہارا لیتے تھے۔

سید محمود وحید الدین
(مدیر رہبر دکن)

ملک کا سپاہی

اس جہان مسلسل میں انسانی زندگی کے نشیب و فراز بعض وقت کتنے اچانک کتنے غیر متوقع اور کتنے روح فرسا ہوتے ہیں۔ حیات اور موت کا رشتہ کتنا قریب اور کتنا عجیب ہے۔ ابھی تک جس گوشۂ حیات سے ہم زندگی اور کامرانی کی تفسیریں سن رہے تھے وہیں بیٹھے آج زندگی کی ناپائیداری پر آنسو بہا رہے ہیں دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں نہ جانے کتنے سانحے ہو جاتے ہیں لیکن سب ہی یکساں دردانگیز اور جانکاہ نہیں ہوتے۔ ملت اسلامیہ دکن کی نشاۃ ثانیہ

کے جلیل القدر مجاہد کی موت ہندوستان کے لاکھوں قلوب کی آرزوؤں اور تمناؤں کی موت ہے۔

یہ خطابت کی ہیوگی وضعداری شرافت، خلوص تدبر اور جذبۂ خدمت کا جنازہ ہے، قوم کا یہ سپاہی اپنا تن من دھن سب اپنی ملت پر نچھاور کر چکا تھا۔ اس کا ایمان محکم وفاداری مستحکم عمل پیہم نظر بلند سخن دل نواز اور فکر مرتب تھی۔ جب دیکھیے مسکراتے ہوئے ہشاش بشاش اپنے اور غیر کا کوئی لحاظ نہیں سبھی کے ساتھی، زندگی کی ساری توانائیوں کے ساتھ مسائل نمٹنے کے لیے ہمیشہ تیار نہ اپنی راحت و آرام کا خیال نہ محنت و تکان کا احساس، بارگاہ خسروی کا یہ حاضر باش، غریبوں اور مفلسوں کا یہ غمگسار کہیں مشیر، کہیں مقرر، کہیں دوست، کہیں محسن، کہیں قائد یکساں مقبول سب کی نظروں کا تارا اور ہر دلعزیز۔

اسلام کا سچا شیدائی آج مادی طور پر ہم میں نہیں اپنے خالق کے سایہ میں چین اور آرام کی نیند سو رہا ہے۔ کارساز حقیقی کے پاس اس کا مقام اس کی بے لوث خدمت کی مناسبت سے بلند و بالا ہوگا۔ وہ اس دنیائے فانی میں ہمارے ساتھ رہے یا نہ رہے اس کا تعلق ہم سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔

لوگوں کی زندگیاں موت سے بھی بدتر ہوتی ہیں نواب کی موت زندگی کی ایک مستحکم ضمانت ہے، انسان مر سکتا ہے اس کی خوبیاں نہیں مر سکتیں۔ قائد مر سکتا ہے لیکن اس کے کارنامے نہیں مٹائے جا سکتے۔

قائد کی موت آنسو کی نذر نہیں مانگتی۔ ان کی قبر پر پھولوں کی چادر کی ضرورت نہیں ان کی روح تنظیم اور خدمت کا مظاہرہ چاہتی ہے نواب کی موت پر دھاڑیں مار کر رونے والوں کی نظر میں نواب کے ورثہ کی طرف اٹھنا چاہیے۔

کتنے مسائل اور کتنے کام ہیں اپنے تعلق خاطر کا مظاہرہ زبان سے نہیں عمل سے ہونا چاہیئے ایسے قائد کی موت پر ماتم اور آہ و بکا بھی ہمارے شایان ہیں۔ قائد کی موت کچھ اور چاہتی ہے ..... اس کا نمونہ اسی کی زندگی میں ڈھونڈیئے نوجوانوں اور خدمت گذاروں کے رہبر کی زندگی ایک نشان راہ ہے جو منزلِ مراد کی طرف بلا رہی ہے ..... وہ زندگی بھر مسکراتے رہے ہر تکلیف کو تبسم انگیز کیا۔ دیکھیئے وہ اب بھی کھڑے مسکرا رہے ہیں، قائد ملت کی قسم ان کے خلوص و ایثار کی قسم مسلم قوم زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ کارکنان مجلس (اتحاد المسلمین) قائد ملت کے بعد بھی منزل اور مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی جانبازی حکمت اور تدبر کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں گے۔ سپاہی کی جگہ کبھی خالی نہیں ہوتی۔ قائد ملت نے جو دیا روشن کیا تھا وہ بجھ نہیں سکتا۔ اس گوشہ سے ہزاروں چراغ روشن ہوتے ہیں اور ہو چکے ہیں۔ اسی نقش قدم پر چل کر ملک اور قوم کے یہ خادم تاریخ کے لیے ایثار و فاداری بے نیازی جرات تدبر اور سیاست کا ایک نیا ورق تیار کریں گے۔ ملت کے اس فدائی کی روح اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

از مولوی سید احمد عارف صاحب مرحوم مدیر "صبح دکن"

کارواں باقی ہے میر کارواں جاتا رہا

ذہن اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ مولوی بہادر یار جنگ

کو موت نے ہم سے چھین لیا۔ طبیعت اس اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتی کہ ملت اسلامیہ دکن کا واحد رہنما فنا کے راستوں پر گم ہو گیا۔ یقین نہیں آتا کہ جس کی آواز میں سوتے ہوؤں کو جگانے کی قوت تھی وہ خود آج دائمی نیند سو رہا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی ماننا پڑتا ہے کہ نواب صاحب ہم سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ کیا ان کی موت کو محض ایک انسانی موت کہا جا سکتا ہے اور کیا صرف ایک شخصیت نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ بے پایاں غم و اندوہ کے ہنگامے میں سکون کا ایک لمحہ میسر ہو تو اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج صرف ہمارے محبوب قائد بہادر خاں ہی کا انتقال نہیں ہوا بلکہ وہ تمام خصوصیات مر گئیں جنہیں آپ کی ذات میں درجۂ کمال تک پہنچنا نصیب ہوا تھا۔ شرافت مر گئی جس کا افسوں آپ کے تمام ملنے والوں پر طاری تھا۔ خطابت مر گئی جس سحر نے دوستوں ہی کو متاثر نہیں کیا تھا بلکہ اکثر مواقع پر مخالفین کے خیالات کا رخ بھی بدل ڈالا تھا۔ جوشِ عمل مر گیا جس نے کچھ ہی دن پہلے ورنگل میں خس پوش جھونپڑیوں کو طوفانی بارش کا حریف بنا دیا تھا۔ فکر و نظر کی رفعت مر گئی جو مرحوم کی فطرت کا جزو تھی۔ اور جسے وہ اپنے رفقائے کار میں بھی دیکھنا چاہتے تھے، رواداری اور وسیع النظری مر گئی جس کی وجہ سے آپ صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ معقولیت پسند برادرانِ وطن میں بھی بہت مقبول تھے۔ ان خصوصیات کی فہرست بہت طویل ہے اتنی طویل کہ اس پر نظر ڈالتے وقت دل کا ٹکڑا ٹکڑا اور سوا ہو جاتا ہے۔

انسانیت اور قیادت کے کیسے کیسے انمول جوہر تھے جنھیں مرحوم اپنے ساتھ لے کر ہم سے رخصت ہو گئے اور مسلمانانِ دکن کو انتہائی نازک وقت میں اس قافلہ کی طرح چھوڑ گئے جو موت و زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہو اور اپنی راہ متعین نہ کر سکتا ہو۔

دنیا میں موت سے بڑی کوئی حقیقت نہیں اور حقیقت کی کارفرمائی کے سامنے گردن جھکانی پڑتی ہے۔ آج قائدِ ملت نے اس منزل کو طے کیا کل ہم اور آپ سب اسی راستہ سے گزریں گے رونا اس بات کا ہے کہ قحط الرجال کے موجودہ دور میں ایک ایسی شخصیت ہم سے چھین لی گئی جس کا بدل ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ مدتوں کے بعد چمن میں ایک دیدہ ور پیدا ہوا تھا قدرت نے اسے بھی رہنے نہ دیا۔ دکن کی سیاستِ اسلامی کے افق پر ایک ستارہ چمکا تھا جس کی روشنی دور دور تک پہنچ رہی تھی اور اس روشنی کے سہارے سے بھٹکے ہوئے مسافر منزل کا سراغ پا رہے تھے۔ یکایک ستارہ ٹمٹمایا اور لامحدود خلاء میں گم ہو گیا قومی ترقی کی محفل میں ایک شمع روشن ہوئی تھی اور اس کے نور سے فائدہ اٹھا کر حصولِ عظمت کے طریقے مدون کیے جانے والے تھے۔ یک بیک شمع جھلملائی اور ساری محفل تاریک ہو گئی۔ ہم بنیادی طور پر قنوطیت کو پسند نہیں کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قائدِ ملت کی وفات نے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی بظاہر محال ہے۔ زندگی کی گاڑی اسی طرح چلتی رہے گی عالمی سیاسیات کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں کی سیاست بھی نشیب و فراز سے گذرے گی، پلیٹ فارم اسی طرح سجاتے جاتے رہیں گے مقررین اسی طرح زورِ خطابت کا مظاہرہ کرتے رہیں گے غرض کہ زمانہ اپنے سابقہ انداز میں

ہزاروں پہلو بدلے گا لیکن چشم بینا ہر ماحول میں ایک کمی محسوس کرے گی ہر عالم میں کسی کو ڈھونڈے گی اور ہر مقام پر کسی کو نہ پاکر مایوسی کے آنسو بہانے پر مجبور ہو جائے گی۔

قائد ملت صرف ایک لیڈر ہی نہ تھے بلکہ ایک مکمل انسان تھے ان کی خصوصیتیں فراموش نہیں کی جاسکتیں ان کی فطرت کی سادگی اور طبیعت کا خلوص ہر ماحول کو اپنا لیتا تھا۔ ان میں ایک انفرادیت تھی ایک امتیازی وقار تھا سیاسی پلیٹ فارم ہو یا شعر و ادب کی محفل فلسفیانہ صحبت ہو یا مذہبی اجتماع ہر جگہ بہادر خاں کی شخصیت اور اس شخصیت کی ہمہ گیری نمایاں تھی ہے۔ خطیب اب بھی موجود ہیں سیاست آج بھی مل سکتے ہیں علما کی اس وقت بھی کمی نہیں مگر وہ بات کہاں ع

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

سنتے ہیں کہ مرحوم کی اولاد نہیں ہے لیکن ہماری رائے میں یہ خیال صحیح نہیں مجلس اتحاد المسلمین کو آپ کی اولاد کہا جاسکتا ہے، آپ نے اس ادارہ کو ذہنی، جسمانی صوری، معنوی تربیت کے لیے بڑی بڑی مشکلات کا مقابلہ کیا، یہ ادارہ آپ کی پرخلوص سرگرمیوں اور مسلسل مشقتوں کی یادگار ہے۔ اس یادگار کو باقی رکھنا ان لوگوں کے لیے فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے جو آج تک آپ کے شریک کار رہے ہیں۔ ہماری قوم ایک مردہ پرست قوم ہے وہ زندگی میں اپنے محسنوں کی قدر نہیں کرتی لیکن ان کے بچھڑنے کے بعد آنسو بہاتی ہے، یادگاریں قائم کرتی ہے یوم منانتی ہے۔ ہماری رائے میں قائد ملت کی اس سے بہتر کوئی یادگار نہیں ہوسکتی کہ آپ کے نصب العین کو زندہ رکھنے کی کوششیں کی جائیں۔ ان لوگوں میں جنہیں مرحوم کا قرب حاصل رہا ہے ایسے حضرات موجود ہیں، جو اپنے قائد کے حقیقی مقصد کو

اچھی طرح سمجھ چکے ہیں اس مقصد کے حصول کی خاطر جد و جہد جاری رکھنا ان کے لیے لازمی ہے۔ قائد ملّت کے احسانات کا کوئی عارضہ ممکن نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کی وہ خواہش پوری کرنے کی سعی کی جائے جس میں موت کے ظالمانہ اقدام نے پورا ہونے نہیں دیا۔ ان سطور کے خاتمہ پر تصور نے بیت الامت کا دردانگیز منظر نگاہوں سے قریب کر دیا۔ دالان میں ایک لاش رکھی ہوئی ہے یہ دکن کے اسلامی مجاہد کی لاش ہے۔ اس مردِ مومن کی لاش ہے جس کی زندگی ترقیِ ملّت کے نقشے بنانے میں ختم ہوگئی۔ اس میر کارواں کی لاش ہے جس نے گہری تاریکیوں میں منزل کے نشان تلاش کیے۔ چہرے پر ایک آسمانی نور چھایا ہوا ہے اور غیر متحرک ہونٹ اب بھی اپنے عقیدت مندوں کو سعی و عمل کا پیام دے رہے ہیں۔ خدا اس لاش پر رحمت کے موتی برسائے اور اس کے مدفن کو شمیم جنّت سے معمور کرے۔ ع

خور درشید و لے شعلۂ مستعجل بود

خواجہ معین الدین۔ بی اے (عثمانیہ)

قائد ملّت کا عہد نوجوانی

جاگیرداروں، منصبداروں اور زمینداروں سے حیدرآباد کبھی خالی نہیں رہا۔ حیدرآباد کے ہر گلی کوچے میں ایک نہ ایک جاگیردار اور اس کی ایک نہ ایک عالی شان حویلی نظر آتی ہے اس حویلی سے دن میں تین دفعہ نوبت

اور شہنائی کی آواز نہ جانے کتنے سال سے مسلسل آرہی ہے اور اس کے باب الداخلے پر نہ جانے کتنے سو سال سے عرب اور روہیلا اپنی بندوق تانے کھڑا ہے تاکہ کوئی غریب، مفلوک الحال انسان اس حویلی میں داخل ہو کر اپنے پسینے کی بدبو سے حویلی کی معطر فضا کو گندہ نہ کر دے۔ آسمان نے ہزاروں رنگ بدلے زمانے نے کئی کروٹیں لیں۔ حیدرآباد کئی انقلابات سے دوچار ہوا لیکن جاگیردار کی ضعداری اور اس کی حویلی کی چوکسی میں کوئی تغیر نہ ہوا، وہی شان و شوکت وہی عیش و عشرت، وہی غرور و نخوت، وہی نوبت و نقارہ۔ باب الداخلے پر عرب اسی شان سے کھڑا رہا، نوبت اور شہنائی اسی طرح بجتی رہی۔ اورنگ زیب کے ہندوستان کو انگریزوں نے لوٹ لیا۔ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ گھوڑے کی پشت سے زمین پر گر پڑا۔ ٹیپو خاں کے دردمند دل سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے لفٹننٹ ہٹسن نے بہادر شاہ کو حراست میں لے لیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے دونوں بیٹوں کو نشانہ بنا کر ان کی نعشوں کو بے گور و کفن پھینک دیا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن رات بھر عیش و طرب میں مصروف رہنے والا جاگیردار دن چڑھنے سے پہلے بیدار نہ ہوا۔ شریف اور باعصمت بیویاں جن کے نقش و قدم تک نگاہوں کی رسائی ممکن نہیں تھی بھوک اور فاقوں سے مجبور ہو کر چادریں اوڑھے دلی کے گلی کوچوں میں بھیک مانگنے نکل آئیں۔ بادشاہوں کی اولاد فقیروں کی طرح پھرنے لگی۔ کل تک جن کی داد و دہش کے چرچے تھے آج مجسم سوال بنے کھڑے تھے۔

اور حیدرآباد کے جاگیردار کی حویلی میں ہزار ہزار کی کرنسی نوٹ کی

آنچ پر چائے گرم ہو رہی تھی۔
دیکھتے ہی دیکھتے شمالی سرکار، مچھلی پٹن، برار حتیٰ کہ سکندرآباد ہاتھوں سے نکل گیا۔
لیکن جاگیردار کی حویلی سے شہنائی کی سریلی آواز برابر آتی رہی۔
حیدرآباد جاگیردار سے مایوس ہو گیا حیدرآبادی عوام جاگیرداروں سے نفرت کرنے لگے جاگیروں میں بسنے والی رعایا اپنے کو غلام در غلام سمجھتے خود جاگیردار کی فضول خرچی نے اس کو مارواڑیوں اور بنیوں کا دست نگر بنا دیا۔ بڑی بڑی جاگیریں اور اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب مارواڑی کی ایک چھوٹی سی تجوری میں بند ہونے لگے اس کی ڈیوڑھی کے آگے قرض خواہوں اور طعن و تشنیع کرنے والوں کا ایک ہجوم رہنے لگتا۔ جاگیردار کا وقار ختم ہو گیا جاگیر رہن ہو گئی لیکن جاگیردار ابھی باقی تھا۔ شہر کے ایک کونے میں گلی کی ایک موڑ پر ایسی ہی ایک گلی کے عین مقابل والی حویلی میں جو کولسہ واڑی سے ہو کر بیگم بازار کی تنگ سی سڑک کو ملاتی ہے۔ ۵ فروری (۱۹۰۵ء) نصیب یاور جنگ ثالث کے مکان ایک لڑکا تولد ہوا۔
بہادر خاں ـــ نقاروں پر زور زور سے چوب پڑنے لگی، شادیانے بجنے لگے۔ مبارک و سلامت کا شور بلند ہوا۔ ساری ڈیوڑھی میں مسرت و انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی ـــ لیکن اس نوبت و نقاروں کی آواز میں ایک روتی ہوئی آواز بھی تھی جو گویا نصیب یاور جنگ کی بیجا نمود و نمائش پر طنز کر رہی۔ وہ نومولود بہادر خاں کی آواز تھی۔
نوبت و نقاروں کے شور میں ایک روتی ہوئی آواز۔

یہ آواز ۳۶ سال بعد دکن کے ۳۵ لاکھ مسلمانوں کی آواز بن گئی اور (۳۸) سال بعد ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ــــ یہ آواز مسجدوں میں گونجی، ممبروں سے بلند ہوئی، میدانوں میں سنائی دی مشرقی گھاٹ اور مغربی گھاٹ سے ٹکرائی اور سارے دکن میں ایک غلغلہ پڑ گیا لوگ جوق در جوق اس کی آواز کی طرف آنے لگے۔ ہزاروں کی تعداد میں لاکھوں کی تعداد میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے جب یہ آواز فضا میں بلند ہوتی تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہندوستان کے بے عمل اور بے راہ مسلمانوں پر دوبارہ قرآن نازل ہو رہا ہے لوگ اس آواز کے اطراف اس امید میں جمع ہو گئے کہ اب کسی قرآنی اسرار کا افشا ہوگا۔ حیدرآباد ــ حیدرآباد سے باہر ہندوستان کے ایک ایک گوشہ میں افغانستان کی پہاڑیوں میں، سندھ کے ریگستان میں دلّی کے محلات میں، بمبئی کے پُر ہجوم بازاروں میں ایک ہی آواز گونجنے لگی، ایک ہی آواز سنائی دینے لگی۔

دلکش، مترنم، دل کو موہ لینے والی آواز۔ آج بھی وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

"ساری تعریف اس خدائے قدیر و قیوم کو سزاوار ہے جس کا تخت عظمت و جلال ہمیشہ سے آراستہ ہے اور ہمیشہ آراستہ رہے گا اور جس کی بارگاہ عزو وقار میں صرف ان افراد نے جگہ پائی جنھوں نے نتائج اعمال کا یقین رکھا اور عمل صالح کو شعار بنایا اور جس کے آستانہ مقدس سے وہ دھتکار دیئے گئے جو کچھ نہ کر کے سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے جس کی قرب و نزدیکی کا مقام صرف ان ہی کو نصیب ہوا جنھوں نے اس کی راہ میں

سب کچھ لٹا دیا اور اس کی مسند الوہیت خلعت و دوستی کا مرتبہ ان ہی کو عطا ہوا جنھوں نے اس کے لیے اپنے لختِ جگر اور خونِ دل تک کی پرواہ نہیں کی درود و سلام اس افضل الرسل اور سید انبیاء کو ایک مستقل وظیفہ حیات قرار دیا اور دین حنیف کو زندگی دوام عطا کی۔"

لیکن ۵ فروری کون جانتا تھا کہ اس آواز میں ایک جادو ہوگا، ایک سحر ہوگا ایک طلسم ہوگا جو دکن کے (۳۵) لاکھ پراگندہ اور منتشر مسلمانوں کے قلوب کو ایک دوسرے سے ایسا جوڑ دے گا کہ وہ جرأت و عزم کی ایک چٹان بن جائیں گے جن سے ٹکرانے والی موجیں خود غرق عرق ہو جائیں گی اور جن سے زور آزمائی کرنے والے طوفان خود پاش پاش ہو جائیں گے۔ حیدرآباد تو یہی سمجھتا رہا کہ ایک اور جاگیردار پیدا ہوا۔ نصیب یاور جنگ کا چشم و چراغ جس کی ساری صلاحیتیں اس کی حویلی کی اونچی اونچی اور موٹی موٹی دیواروں کے اندر ہی محدود رہے گی اسے کیا معلوم تھا کہ اس چراغ کی ضیاء پاشیوں سے کتنے عظیم الشان جلسہ ہائے میلاد جگمگا اٹھیں گے حیدرآباد کی کتنی تاریک راتیں منور ہو جائیں گی اور ذکر رسول سے مسلمانوں کے قلوب و نظر کے کتنے تاریک گوشے روشن ہو جائیں گے۔

حیدرآباد تو اس نومولود کو ایک جاگیردار سمجھتا رہا۔

نوبت نقارے بجتے رہے مبارک و سلامت کا سلسلہ جاری رہا۔ اچانک ۱۳ فروری کو لوگوں نے دیکھا کہ نواب نصیب یاور جنگ کی حویلی ایک ماتم کدہ سی بن گئی ہے نوحۂ ماتم سے حویلی کے در و دیوار لرز اٹھے ہیں اور نواب نصیب یاور جنگ تصویر غم بنے اک جنازے کے پیچھے جا رہے ہیں ـــــ آہ یہ نومولود بہادر خاں کی ماں کا جنازہ تھا جو مجسم ہو کر بہادر خاں کی صورت میں جلوہ گر ہوئے تھے اس

ماں کا جنازہ تھا جس کے سپوت کی آواز سے ہندوستان کی مردہ قوم میں زندگی کی ایک لہر دوڑنے والی تھی۔ ماں کے کان آواز کے اس طلسم سے ناآشنا رہتا ہے۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے ۸ دن کے نونہال کو آغوش مادر سے محروم کر دیا۔

یہ شاید پہلی سنت تھی جو بہادر خاں نے ۸ دن کی عمر میں عطا کی۔

آغوش مادر کے بغیر نصیب یاور جنگ کی عالیشان حویلی اس نومولود کے لیے ایک غم کدہ بن گئی۔ اس عالیشان غم کدے میں تڑپتے ہوئے اس نومولود کو بالآخر ضعیف اور خداترس نانی کی آغوش میں راحت نصیب ہوئی۔ دن گزرتے گئے اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا یہ قائد امید وارمانوں سے پھولنے پھلنے لگا۔ ایک سال ــ دو سال ــ تین سال کا یہ صحت مند تندرست و توانا، اونچی پیشانی بڑی بڑی آنکھوں گورے گورے گالوں اور بھرے بھرے جسم کا یہ بچہ اپنی ضعیف نانی کی جانماز پر بیٹھا ان کے رکوع و سجود کی نقل کر رہا۔ اس کی معصوم جبین خدا کی بارگاہ عزوجل میں جھکی ہوئی ہے۔ کعبہ کدھر ہے، خدا کون ہے، نماز کیا ہے ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر کعبہ کی سمت میں تین سال کا ایک ننھا سا دل کی دھڑکن اس کی تلاوت تھی اور یہی دھڑکن اس کی نماز معصوم نمازی۔ تیرے دل کی یہی دھڑکن ایک دن ہندوستان کے دس کروڑ دلوں کی دھڑکن بن گئی۔

چار سال کے سن میں جب یہی دھڑکنیں بولنے لگیں اور تتلاتی ہوئی زبان کو قوت گویائی عطا ہوئی تو اس ضعیف و خداترس خاتون نے آہستہ سے اس نونہال کے آگے جبریل کے سینے کا راز خدا کا کلام اور محمد کا پیغام رکھ دیا۔

ــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــ

شہنائیوں کی آواز سے حویلی جھومنے لگی شادیانے بجنے لگے، مٹھائیاں تقسیم ہونے لگیں، مبارک وسلامت کا شور بلند ہوا، ننھے بہادر خاں کے یہ پہلے بول تھے جو محفل کو گرما گئے۔

جب دوسرے دن مبارک وسلامت کا شور ختم ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ حویلی کے آگے چار گھوڑوں کی ایک خوبصورت گاڑی کھڑی ہے، چار سال کا ایک خوبصورت بچہ ڈیوڑھی سے نکلا۔ ملازم نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا لڑکا سوار ہوا، کوچوان نے چابک دکھائی بے قرار تھرکتے ہوئے گھوڑے دوڑنے لگے مدرسۂ عالیہ کی عمارت آگئی، لڑکا اتر گیا، تین سال گزر گئے۔ جو کڑے کا رخ مدرسۂ مفید الانام کی طرف پھر گیا۔ پھر آل سینٹس ہائی اسکول کی طرف۔

بالآخر دار العلوم ہائی اسکول کی گیٹ میں چار گھوڑوں والی ایک گاڑی تیزی سے داخل ہوئی۔ لوگوں نے گھوڑے کو راستہ دے دیا۔ گاڑی عین پرنسپل کے اجلاس کے آگے رکی۔ ایک بارہ سالہ تندرست، توانا خوبرو لڑکا گاڑی سے اترا پرنسپل کے اجلاس کی چلمن اٹھائی اور اندر غائب ہوگیا۔

آج یہ خوبرو لڑکا حیدرآباد کی مشہور ومعروف درسگاہ کا ایک طالب علم ہے جماعت میں اپنی وضع قطع اور قیمتی لباس کی بنا پر سب سے زیادہ نمایاں اور تقریری مقابلوں میں سب سے اول۔

دار العلوم میں یہی ایک لڑکا ہے جو ہر ہنگامے میں سب سے آگے نظر آتا ہے۔ تقریری مقابلے ہو رہے ہیں بہادر خاں نے آگے بڑھ کر پہلا انعام حاصل کیا سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بہادر خاں مسکراتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا نشانہ بازی کے مقابلے ہو رہے ہیں بہادر خاں نے ایک ہی نشان پر پوری

پانچ گولیاں ثبت کردیں۔ تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے بہادر خاں اپنی بندوق کو کندھے سے لگائے اپنے ساتھی طالب علموں کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ پیراکی کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لہراتی ہوئی موجوں میں بہادر خاں سب سے آگے نظر آرہا ہے۔

بہادر خاں ــ بہادر خاں فصیح البیان مقرر ہے، بہترین نشانہ باز ہے۔ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ دلیر۔ حیدرآباد کا مشہور جاگیردار، امیر ابن امیر انتہائی قیمتی لباس پہنتا ہے۔ چوکڑے میں آتا ہے ملازمین پر حکم چلاتا ہے۔ لیکن اگر بہادر خاں میں صرف یہی اوصاف ہوتے تو وہ بہت جلد مرجاتا اپنی عالیشان حویلی میں مرجاتا، اپنی خوبصورت گاڑی میں مرجاتا، اپنے زرق لباس میں مرجاتا، دنیا جاننے کی کوشش نہ کرتی کہ بہادر خاں کون تھا۔

لیکن بہادر خاں مر نہ سکا۔ بہادر خاں مر نہیں سکتا۔

دارالعلوم کالج کے احاطہ میں ایک خوبصورت چوکڑی آکر رکا۔ ملازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ بہادر خاں گاڑی سے اترا۔ لال لال معری ٹوپی ٹویڈ کی بہترین شیروانی، پیروں سے لپٹا ہوا سفید پاجامہ، پاؤں میں قیمتی جوتا اور گلے میں کمدرکی ایک جھولی۔ ترک کے مظلوم مسلمانوں کے لیے، زخمیوں کے لیے بیواؤں کے لیے بہادر خاں اپنے ساتھیوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔ بہادر خاں کے ملازم اسے بھیک مانگتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ حیدرآباد کا اتنا بڑا جاگیردار نواب نصیب یار جنگ کا نور نظر جھولی گلے میں ڈالے سر بازار دامن پھیلائے لوگوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔

بیا جانا تماشہ کن کہ دو انبوہ جانبازوں بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

گھنٹی بجی سب لڑکے اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔ بہادر خاں پرنسپل کے اجلاس کی طرف چلا۔ اپنی بھری ہوئی تھیلی ان کی میز پر خالی کر دی اور خاموشی سے اپنی جماعت میں جا کر بیٹھ گیا۔

نصیب یاور جنگ کی بڑی آرزو تھی کہ ان کا لڑکا منشی ہو جائے۔ ابھی کچھ دن ہوئے نواب نصیب یاور جنگ کی حویلی کے بازو ہی ایک غریب مسلمان لڑکے نے منشی کا نصاب کیا تھا۔ نصیب یاور جنگ نے اس لڑکے کے اعزاز میں ایک نہایت ہی پر تکلف دعوت ترتیب دی تھی۔ کاش بہادر خاں بھی منشی ہو جاتا۔ نصیب یاور جنگ نے اپنے استاد علامہ شمسی سے درخواست کی کہ وہ بہادر خاں کو منشی بنا دیں۔ علامہ شمسی نے وعدہ کیا لیکن اس شرط پر کہ بہادر خاں ان کے مکان پر حاضر ہوا کرے۔ کڑاکے کی سردی ہے فجر کی نماز کے بعد درس کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ بہادر خاں چوکڑے میں سوار بیگم بازار سے چنچل گوڑہ جا رہا ہے لیکن علامہ موصوف کو پڑھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ سردیاں پوری گزر گئیں گرمی کا زمانہ شروع ہو گیا۔ مارچ۔ اپریل، مئی جون درس کے اوقات نماز فجر کے بعد مقرر ہوئے، بہادر خاں روزانہ اپنے وقت پر جا رہا ہے لیکن پڑھانے کا وہی عالم۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایک دن حسب معمول بہادر خاں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ علامہ کی نظریں بہادر خاں کی طرف اٹھیں۔ لبوں پر ایک عجیب تبسم کھیلنے لگا جیسے آج سب کچھ مل گیا ہے علامہ نے اٹھ کر بہادر خاں کو گلے سے لگا لیا۔

بہادر خاں تو بڑے گا تو بہت بڑا عالم ہو گا۔ تجھے علم کا شوق ہے خدا تیرے دل کو علم و ایمان کی روشنی سے منور کر دے۔

علامہ سلیمان ندوی حیدرآباد آئے ہیں۔ بہادر خاں کو معلوم ہوتا ہے فوراً سلام کے لیے حاضر ہوتا ہے اور نہایت ہی ادب سے عرض کرتا ہے۔ میں آپ کا شاگرد ہوں ۔ بہادر خاں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی آئے ہیں۔ بہادر خاں اسی طرح مودبانہ طریقے سے عرض کر رہا ہے۔ میں ہوں آپ کا شاگرد ۔ بہادر خاں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی حیران ہیں کہ یہ میرا کونسا شاگرد ہے جس کو میں آج پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں لیکن جب مولانا نے دیکھ لیا تو آخر تک اس کا شاگرد کو بھلا نہ سکے۔

دن گزرتے گئے پورے (۶) سال گزر گئے۔ آج بہادر خاں کی عمر (۱۸) سال کی ہے۔ آج بہادر خاں نہایت مغموم ہے، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے وہ ابھی ابھی اپنے باپ کی میت کو مٹی دے کر آیا ہے۔ آج وہ یتیم ہے، بے سہارا ہے نصیب یاور جنگ نے اپنے والد سے (۱۵) لاکھ روپے نقد علاوہ جاگیر کے حاصل کیا تھا لیکن اپنے بیٹے بہادر خاں کے لیے ۴½ لاکھ روپے کا قرض چھوڑ گئے۔ آج بہادر خاں کے اطراف قرض خواہوں کا ہجوم ہے۔ وارثوں کی سازشیں ہیں۔ عزیز و اقارب کا رشک و حسد ہے اور پھر اتنی بڑی جاگیر کا انتظام و اہتمام ہے اور بہادر خاں کی عمر ہے صرف (۱۸) سال۔

اٹھارہ سال کا یہ نوجوان حاسدوں، دشمنوں، بدخواہوں اور قرض خواہوں کے ہجوم میں بے یار و مددگار، یکا و تنہا کھڑا ہے کوئی اس کا دوست نہیں، کوئی اس کا ہمدرد نہیں، کوئی اس کا مشفق و جاں نثار ساتھی نہیں مایوسیوں کا بھیانک اندھیارا ہے اور بہادر خاں کے قلب میں عزم و ایقان کا ایک جھلملاتا ہوا چراغ ۔ بہادر خاں کی زندگی کا یہ پہلا امتحان تھا۔ اگر

وہ امتحان میں ناکام ہو جاتا۔ آہ ناکامی کے اس خیال ہی سے تصور کے پر جل اٹھتے ہیں۔ اگر بہادر خاں ناکام ہو جاتا، سطح مرتفع دکن شرم سے اپنی گردن جھکا لیتا۔

بہادر خاں گھبرانے اور ہمت ہارنے کے لیے نہیں پیدا ہوا تھا۔ مایوسی اس کے دین میں کفر تھی اور ناکامی اس کے لیے موت۔ وہ اٹھا اور پورے عزم کے ساتھ اٹھا۔

صبح آٹھ بجے ہیں وہ محاسب کے کمرے میں بیٹھا کردی کی جانچ پڑتال کر رہا ہے، دن کے بارہ بجے ہیں وہ اپنے ملازمین کی شکایتیں سن رہا ہے۔ پھر وہ اپنے بھائی بندوں میں گھرا ان کی فرمائشیں نوٹ کر رہا ہے شام کے ۴ بجے ہیں وہ ملاقاتیوں سے گفتگو کر رہا ہے۔ صبح سے شام وہ برابر مصروف ہے ایک نہ ایک کام کر رہی رہا ہے۔ وہ (۸) سال تک اسی طرح مصروف رہا اور ۸ سال تک اسی طرح مسلسل لگاتار کام کرتا رہا۔

ایک روز صبح صبح جاگیر کا محاسب کاغذات کا ایک پلندا بغل میں دبائے ہوئے حاضر ہوا۔ بہادر خاں نے مسکراتے ہوئے پوچھا آج بہت مسرور نظر آتے ہو ـــــ کیا بات ہے۔

محاسب کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ حضور۔ آج سارا تقاضا ختم ہوا، اور سلک میں ایک لاکھ روپیہ وافر موجود ہے۔

بہادر خاں کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک سی آگئی جیسے مدتوں کی آرزو پوری ہوئی ہو اسی وقت محاسب کو حکم دیا۔ ہمارے پاسپورٹ کا بندوبست کرو ہم کعبۃ اللہ کے دیدار سے مشرف ہونا چاہتے ہیں۔

اپنے جاگیردار سے اس قسم کا جواب سن کر محاسب ششدر رہ گیا۔ وہ سمجھتا تھا کوئی شاندار جلسہ ہوگا پر تکلف دعوت ہوگی۔ غیر متوقع جواب سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔ حضور ابھی ابھی تو مصیبت سے نجات ملی ہے۔ کچھ دن تو آرام کر لیجئے آئندہ سال دیکھا جائے۔

بہادر خاں کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ چیخ کر کہا کیا تم اس کی ضمانت دے سکتے ہو کہ میں آئندہ سال تک زندہ رہوں گا۔ کر سکتے ہو اس کا دعویٰ، اور محاسب چپ ہو گیا۔

غوث۔ خاموشی

قائدِ ملّت ایک انسان

اس موضوع پر مجھ جیسے شخص کا قلم اٹھانا موضوع کے ساتھ انصاف نہ کرنا ہے۔ قائدِ ملت مرحوم نے اس وقت اس جہانِ فانی سے کوچ کیا ہے جس وقت کہ ہمارے شعور کی آنکھیں بھی نہ کھلی تھیں۔ بس اس سعادت پر نازاں ہیں کہ "دارالسلام" سے قریب سکونت کے باعث دو چار تقاریر سننے کا اتفاق ہوا۔ تقاریر سننے سے زیادہ یوں کہئے کہ انہیں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور اسی زمانے سے ان کی ذات سے ایک عقیدت وابستہ ہو گئی ۔ جس شخصیت کے بارے میں علامہ عبدالماجد دریابادی کا یہ

ارشاد ہو کہ:

"دل کے ساتھ دماغ، جوش کے ساتھ ہوش، ایمان کے ساتھ فہم و تدبر کی ایسی جامعیت عمر فاروق کے بعد تاریخ ملت میں کم تر ہی کہیں نظر آئے گی۔"

اس کے بارے میں میرا یہ احساس ہے کہ قائد ملت پر جو کام ہونا چاہیے تھا ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اس کی وجوہات مختلف ہو سکتی ہیں۔ آپ کے انتقال کے وقت ہی ہندوستان کی سیاسی صورت حال دگرگوں تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا۔ اور تقسیم سے پیدا شدہ مسائل سے دو چار رہا۔ مملکت آصفیہ کو زوال ہوا وہ خواب جو دیکھا گیا پراگندہ ہوا۔ ان حالات میں خصوصاً حیدرآباد کے مسلمان اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ مرحوم قائد کے افکار اور عمل اور ان کی زندگی پر تصنیف و تالیف کا قابل قدر کام کرتے۔ مگر ابھی تک یہ ایک قرض ہے جس کو ادا کرنا ہے۔ ورنہ اس عظیم شخصیت اور ملت کے محسن کے ساتھ سب سے بڑی ناقدری ہوگی۔

آج سے نصف صدی پہلے کے جاگیردار کس درجہ عیش و عشرت کے شکار تھے۔ راگ و رنگ کی وہ محفلیں آراستہ و پیراستہ رہتی تھیں کہ آج بھی سارے ہندوستان میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ نواب زادوں کی عیش کوشی، راحت پسندی، تساہل و تکاہل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک عرصہ تک ضرب المثل رہیں گے۔ موروثی جاگیروں میں پہنچ کر جنگل میں منگل منانا خوشامدیوں کے جھرمٹ میں رہنا، قرضوں کے بوجھ میں اضافہ ہی کرتے چلے جانا۔ چند بندھے ٹکے رسومات اور تقاریب منعقد کر کے اٹھلاتے رہنا ہر روز عید اور ہر رات

شب برات کرنا یہ تھا وہ جب حیدرآباد کا جاگیردار طبقہ جس کے نواب بہادر یار جنگ آفریدہ تھے۔ اس طبقے سے کل کر اگر نواب مرحوم کچھ اور نہ کرتے اور صرف میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں کی زینت بنے رہتے تب ہی ہم ان کو ایک دردمند اور ایک "انسان" کہنے پر مجبور ہوتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ راحت سامانیوں اور نعم کی مدہوش کن فضاؤں میں ایک قلب تھا جو سوز کے پانی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ ایک نظر تھی جو رفعت نصیب تھی۔ ایک انسان تھا جو تیار ہو رہا تھا۔

کسی شخصیت کو آپ اگر انسانیت کی کسوٹی پر دیکھنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ نے ان چار دیواروں کے درمیان دیکھیں گے۔ جہاں وہ اٹھتا بیٹھتا تھا، سوتا جاگتا تھا۔ اپنے قریبی لوگوں سے ملتا جلتا تھا۔ جلسے "بیت الامت" چلیں جو اس شاہین کا ٹھکانہ تھا۔ بیگم صاحبہ سے گفتگو کیجیے وہ جب "سرکار" کہیں گی تو ایسے محسوس ہوگا کہ یہ کوئی اس جہاں سے گزرے ہوئے کے لیے استعمال نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کے لیے جو موجود ہے جس سے اب بھی رات دن ملتا جلتا ہے۔ بیگم بہادر یار جنگ جب اپنے شوہر نامدار کا کوئی ذکر کرتی ہیں تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ قائد ملت کا انتقال ہو کر (۲۰) سال بھی گزر چکے ہیں۔ "سہاگ لٹنے کی کہانی" میں بیگم صاحبہ کا جو جاگیردار ہے عمیق غم ہے، وہ اس بات کا غماز ہے کہ لاکھوں قلوب کا تاجدار اپنی رفیق حیات کا کس درجہ پاس و لحاظ کرتا تھا۔ ورنہ اس مقام پر پہنچ کر کیسے اپنے اہل و عیال کی اتنی پاسدار ملحوظ ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ کی مسلسل جلسوں میں شرکت اور بیگم صاحبہ کو کتابیں

پڑھنے کے لیے دینا اور خود ہمہ تن گوش بنے سنتے رہنا کیا اس بات کو ظاہر نہیں کرتے کہ وہ اپنے اور اپنی شریک حیات کے درمیان فاصلے رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جاگیر اور دیوڑھی کا پورا انتظام بیگم صاحبہ کے سپرد کر کے کس درجہ عملاً اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔

اپنے ملازمین اور خدمت گزاروں سے کس شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے اس کا اندازہ سید حسین کو دیکھنے سے ہوتا ہے جو آپ کے دیرینہ خادم رہے۔ اب بھی برسی کے موقعہ پر مجسم سوگ بنے مقبرہ کے پاس کھڑے زائرین کی شربت سے تواضع کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ننھی منی بچی کو خواہ وہ کتنے ہی میلے کچیلے کپڑوں میں کیوں نہ رہے، نظر پڑتے ہی لپک کر اٹھا لاتے، گود میں بٹھا لیتے اور تتلی زبان میں باتیں کرتے۔ کافی دیر تک اسے کو ہنساتے خود بھی خوش ہوتے۔ یہ باتیں بہ ظاہر چھوٹی ہیں مگر اس سے وقوع پذیر ہو رہی تھیں جو مسلمانانِ ہند کی آنکھوں کا عموماً اور مسلمانانِ ریاست حیدر آباد کی آنکھوں کا خصوصاً تارہ تھا۔ تمناؤں کا مرکز تھا۔ اس کے باوجود اپنے سینے میں انسان کا دل رکھتا تھا۔

والا بزرگوار کے بعد جب جاگیر کا انتظام سنبھالا تو سب سے پہلا کام قرضوں کی ادائی کا ہوا، اور ساتھ ساتھ چھوٹے بھائیوں کے ساتھ انصاف کیا گیا ان کے حصے ترکے محفوظ کیے گئے۔ کیا حیدر آباد کے جاگیرداروں کے وراثت کے جھگڑوں اور حصے ترکوں کے لیے مقدمہ بازیوں پر جن کی نظر ہے وہ اس واقعہ پر بہادر یار جنگ کی خدا ترسی انصاف پسندی اور چھوٹوں کے حقوق کی حفاظت اپنے مقام سے جائز تمتع سے احتراز کو دیکھتے ہوئے یہ نہ کہہ اٹھیں گے کہ

ہاں۔ بہادر یار جنگ بلند مقام پر تھے۔ واقعی وہ ایک انسان تھے۔
ایک عہد شباب سے گزرنے والے امیر زادے کو جب بزرگی ملتی، امارت و منصب سے سرفراز کیا جاتا، وہ خود مختار ہو جاتا، تب وہی آج سے پچاس سال پہلے کے حیدرآباد میں کیا ہوتا، یہی نا، ناچ و رنگ کی محفلیں، دنیا کے عیش و طرب کی باتیں، سیر و تفریح، شکار لہو لعب کی مشغولیتیں، مگر حضرت ظفر کے اس شعر ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ لاکھ صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے عیش میں خوف خدا نہ رہا

کی روشنی میں دیکھیے کہ نقیب یاور جنگ کا راج دلارا کسی رنگ و نور کی محفل آراستہ کرنے کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ اپنی عبدیت کا حکم دے رہا ہے۔ حج مقدس فرض کی ادائی کے لیے معہ خاندان سفر کا اہتمام کر رہا ہے۔ کیا انسان کا سب بڑا شرف یہ نہیں ہے کہ وہ بندگی کا اظہار کرے۔ سفر میں ہو یا حضر میں، قائد مرحوم کا اپنے خالق سے مسلسل ربط رہتا۔

دس بہ کار اور دل بہ یار، کے مصداق۔

ہر وقت ہونٹوں پر دعائیں رہتیں۔ خود مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس حالت پر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا،

"ایسی مثال اس سے قبل آنکھوں نے دیکھی ہے نہ اس کے بعد"

(قائد ملت بہادر یار جنگ مرحوم۔ از۔ غلام محمد صاحب)

انسان تو وہی ہے جو دوسروں کے دکھ درد میں کام آئے جس کا دل دوسروں کے غم کو اپنے مہمان خانے میں جگہ دے۔ دیکھیے یہ لحیم شحیم رئیس کا پیسہ

کس کس طرح ایک ایک کی غمگساری کر رہا ہے۔ طالب علموں کو سو سو اور دو دو سو روپے دیئے جاتے۔ بیواؤں اور یتیموں کی دستگیری ہوتی۔ مقروض آرہے ہیں۔ نہ ہندو کی تمیز ہے اور نہ مسلمان کا امتیاز ہے۔ ایک مقروض انتہائی بے چارگی کے عالم میں آتا ہے بارہ سو روپے کا قرضہ ہے عالت سے ڈگری کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ امید کی کرن نظر آئی۔ بیت الامت پہنچ گیا۔ سارا قصۂ غم ایک نواب نے پورا پورا وقت دے کر سنا۔ کچھ لکھائی پڑھائی، ضمانت نہ کفالت یکبارگی بارہ سو روپے کے چیک پر دستخط کرتا ہے اور پریشان حال کے حوالے کرتا ہے۔ جانتے ہیں آپ یہ پریشان حال کون تھا۔ ایک ہندو تھا۔ آنے والا جس اعتماد سے آیا تھا۔ اس کے اعتماد کو کوئی دھکا نہ لگا۔ دینے والا جس مقام پر تھا اس سے نیچے نہ اتر سکا۔ یہ بھی تو ایک آزمائش تھی۔ مگر بہادر یار جنگ انسان کے بلند مقام پر ہی فائز رہے۔

جتنے بڑے آدمی ہوتے ہیں ان کی "انا" بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے ــــ بہادر یار جنگ بھی قائد ملت تھے۔ تمام ذیلی بر اعظم ہندوستان پر ان کی خطابت کا جادو چل چکا تھا۔ ساری ریاست حیدرآباد کے مسلمانوں کے وہ مسلمہ قائد تھے۔ اسی خاندانی ہی نہیں واقعی بڑے آدمی کی انا کی آزمائش کی تھی۔ ایک نہیں دو قریبی عزیزوں کا قتل ہوا تھا۔ حیدرآباد شہر کی فضا انتہا درجہ مکدر ہو چکی تھی۔ حیدرآباد کے مسلمان خون کا بدلہ شہر کو آگ اور خون کا شہر بنا کر لینا چاہتے تھے۔ یوں اپنے قائد کے غم میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ مشتعل مجمع تھا جس کے سر پر خون سوار تھا۔ ایسے میں ان کا محبوب قائد آتا ہے جس کے دل میں یقیناً اپنے عزیزوں کی جواں سال موت سے بھٹی سلگ رہی تھی۔ مجمع کا شدید ایک

ہر ایک یہی سمجھ رہا تھا کہ ادھر قائد کی زبان سے ایک لفظ ادا ہوا ان عام ہو۔ اور پھر ہر ایک کے دل کا جوش ابل پڑے۔ مگر بہادر یار جنگ کے دل میں کوئی انتقام کی آگ نہیں بھڑک رہی تھی۔ وہ کوئی بدلا لینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ معصوم شہریوں کے خون سے زمین کو رنگنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک ہی آواز میں ناگواری کے اظہار میں سارا مشتعل مجمع ٹھنڈا پڑ گیا۔ آتش فشاں جو ابل رہے تھے سرد ہو گئے حیدرآباد امن و محفوظ ہو گیا۔

یہ قائد ملت تھے، سراپا رحمت تھے۔ انسانیت نواز تھے۔ اس مقام پر بلبل ہند سروجنی نائیڈو کو کہنا پڑا تھا میں نے عوام کو مشتعل کرنے والے مقررین تو کئی دیکھے ہیں مگر مشتعل اور بے قابو مجمع کو ٹھنڈا اور منتشر کرنے والا سوائے بہادر یار جنگ کے اور کسی کو نہیں دیکھا۔

اپنی جان کی حفاظت کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔ نازک موقع پر اس معاملہ میں وہ کتنا خود غرض ہو جاتا ہے۔ مطالبہ پاکستان کے لیے راہ ہموار کرنے صوبہ سرحد کا طوفانی دورہ ہو رہا ہے۔ موٹر فقیر ایپی کے خطرناک علاقے سے گزر رہی ہے۔ جہاں موت سے ہی استقبال کا امکان ہے۔ جو بھی ڈرائیونگ کرے اس کے نشانہ بن جانے کا یقین ہے۔ خان عیسیٰ آف بلوچستان موٹر ڈرائیونگ کر رہے ہیں۔ یکایک بہادر یار جنگ خود ڈرائیونگ شروع کر دیتے ہیں۔ یوں تو خود کو موت کے مقابل کر دیتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی حفاظت کا سامان کرتے ہیں وہ نہ صرف انسان تھے بلکہ بہادر انسان تھے۔

لاکھوں کو گھوم گھوم کر درسِ انسانیت نواز دینے والا، سب سے

اور آخر خود انسان تھا ـــ وہ اپنے گھر میں بھی انسان تھا اور باہر بھی ـــ انفرادی زندگی میں بھی، اپنوں کے لیے بھی انسان تھا اور پرایوں کے لیے۔ دوسرے اپنے آپ کو اس کے لیے پرائے سمجھتے ہوں تو سمجھیں مگر وہ تو سب کو اپنا سمجھتا تھا ـــ ایسا پرایا جو اپنا ہو۔ بہادر یار جنگ جو انسان تھا ـــ

از:- جناب عبدالرحیم صاحب فضل

قائدِ ملّت کے چند خطوط

مجلس کی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں جب کہ اضلاع میں شاخوں کا قیام عمل آرہا تھا حالات ناخوشگوار تھے۔ جگہ جگہ نے مجلس کی شاخ قائم کرتے ہی قائدِ ملت سے راست ربط اختیار کر لیا تھا۔ معمولی سے معمولی الجھن کو دور کرنے کے لیے قائدِ ملت کو لکھا جاتا تھا اور مشورہ طلب کیا جاتا تھا جہاں سے ہر خط کا تفصیلی اور تشفی بخش جواب مل جاتا جس میں مشورہ بھی ہوتا اور ہدایات بھی لائحہ عمل بھی ہوتا اور مشکلات کا حل بھی چنانچہ آج سے سات سال قبل کے کے چند خطوط کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ قائدِ ملت اپنے کارکنوں سے کس خلوص و محبت کا اظہار فرماتے تھے اور ان کے درد کو کس طرح اپنا درد سمجھتے تھے ایک خط کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔

وعلیکم سلام رحمۃ اللہ ـ خط پہنچا اجازت دیجئے کہ تھوڑی شاعری کروں۔

آپ شاعر ہیں یقیناً میرا مفہوم سمجھ جائیں گے۔ فضا نے کچھ شک نہیں کہ شاہین زادوں کو بھی کبوتر و بٹیر بنا دیا ہے آپ جو کچھ ۔ ۔ ۔ ۔ بھی در و دیوار سے سن رہے ہیں وہ فی الحقیقت بلند تر مقامات کی آواز بازگشت ہے۔ کوشش جاری ہے معجون اور خمیرہ کا زور استعمال ہو رہا ہے۔ دعا کیجئے کہ دوا موثر ثابت ہو، اور مایوسی میں امید کی جھلک نظر آئے۔ بہر حال باہمیں مردان بیا مد ساخت۔ بعض دفعہ ان کو مصلحتاً بھی کجامی نمائی کجامی زنی پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ آنکھ پھوڑنا چاہتے ہیں مگر گھٹنے پر ضرب لگاتے ہیں۔ مسلمان بے قصور ہو کر کیوں گھبراتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی تصویر جو آپ نے کھینچی ہے وہ سخت رنج دہ ہے ان کو بتائیں کہ دیدہ دلیری سے جھوٹے بھی سچے بن جاتے ہیں اور بے جا شرم سچوں کو بھی جھوٹا بنا دیتی ہے۔

یوم مختاری ضرور منائیے لیکن خیر الامور اوسطہا کا اصول اور دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے خدا آپ کی رہبری کرے مشکل مواقع میں آپ کو غیب سے ہدایت ہو، اور ابتدا میں آپ ثابت قدم رہیں۔ سب کو میرا اسلام پہنچا دیجئے۔

۱۹ ر مئی ۳۴ء آپ کا مخلص بہادر خاں غفرلہٗ

ایک اور خط کے جواب میں اپنے کارکنوں کو اس طرح مبارکباد دیکر ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

مولوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب کے جس مصیبت میں مبتلا ہونے کی آپ نے خبر دی ہے اس کا پہلے سے یقین تھا اگر وہ مبتلائے مصیبت نہ ہوتے تو مجھے ان کے خلوص میں شک ہوتا۔ اعلائے کلمۃ الحق اور ابتلا لازم و ملزوم ہیں ان کو میری مبارکباد دیجئے اور عرض کر دیجئے کہ یہ ایسے شخص کی مبارکباد نہیں جو خود آرام سے بیٹھا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اضلاع کے حالات سے واقف ہوں

اور ان طوفانوں کو بھی دیکھ رہا ہوں جو دامنِ مملکت میں چھپے ہوئے ہیں اور مسلمانوں پر برسنے کے لیے بے قرار ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس قدر ثابت قدم ہیں۔ اعلیٰ عہدیداران سرکار سے گفتگو جاری ہے نتائج خدا پر چھوڑتا ہوں پوری توجہ کے ساتھ کام کرتے جائیے اگر فی الحقیقت آئندہ بھی اسلام کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اپنے معیارِ زندگی کو گھٹائیے، خود کو اور بیوی بچوں کو نہایت سادہ زندگی کے عادی بنائیے نہ معلوم یہ عادت کب کام آئے۔ دعا استقامت کرتا ہوں۔

۲۸ شہریور ۱۳۴۷ ف

زبان بندی کے زمانہ میں مسلمانان گلبرگہ حد درجہ بے چین و مضطرب تھے جب ان سے اپنی اس بے چینی اور اضطراب کا اظہار کیا گیا تو جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

میری امتناعِ تقریر سے متعلق آپ کی تشویش و ہمدردی کا شکریہ۔ کیا بارہ برس تک اپنی چیخوں سے حیدرآباد کی فضاء کو معمور کرنے کے بعد مجھے ایک سال بھی آرام کرنے کا حق نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس مسئلہ پر غور نہ کیجئے میں تو یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ فی الحقیقت میری تقریروں میں کچھ اثر نہ تھا اور سننے والوں نے اس کو باور کیا یا نہیں ..... میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ حیدرآباد کی زمین مجھ پر تنگ ہو جائے تو دوسروں کی طرح اس سے ملحقہ علاقوں میں کام کروں۔ یا تو حیدرآباد ہی کی فضا کو سازگار بناؤں گا یا پھر ہمیشہ کے لیے حیدرآباد کو چھوڑ دوں گا ..... میرے دل کی گہرائیوں میں آپ کے لیے جگہ ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کی اور میری تمنائیں پوری کرے۔ ۲ تیر ۱۳۴۷ ف

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ قائد ملت کو خاکسار تحریک سے اختلاف صرف قائد اعظم پر حملہ کے بعد سے پیدا ہوا لیکن یہ غلط ہے۔ قائد ملت کو خاکسار تحریک سے آج سے پانچ سال پہلے پیدا ہو چکا تھا اور عملی طور پر انھوں نے اس میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ ایک اہم خط جو راقم الحروف کے نام ہے پڑھنے سے ظاہر ہوگا کہ قائد ملت آج سے پانچ سال پہلے خاکسار تحریک سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ "سالار اکبر صاحب نے عملی سیاسیات سے متعلق جو الجھن پیدا کر دی ہے اس نے خود مجھے مجبور کر دیا ہے کہ تحریک سے الگ ہو جاؤں میں اس اصول کو خاکسار سیاسیات میں حصہ نہ لیں گے۔ یہ سمجھتا تھا کہ بہ حقیقت جماعت خاکساراں حصہ لیں گے اور انفرادی حیثیت سے حصہ لے سکیں گے۔ کام کرتے ہیں لیکن اب معلوم ہوا کہ خاکسار اپنی زندگی کے ہر پہلو میں خاکسار ہے اس کی جماعتی اور عسکری تنظیم سے ہٹ کر کوئی خانگی حیثیت ہی نہیں یہ اصول چاہے اچھا ہو یا برا مگر میرے لیے ممکن نہیں ہے اس لیے میں نے تحریک سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تھا، اور پریس کو دینے والا تھا کہ سالار اکبر صاحب نے مجھ سے لے لیا کہ علامہ صاحب کو نقل بھیج کر مشورہ کریں گے میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں اس اصول کے مدنظر آپ اپنی نسبت غور کیجئے کہ آپ کیا کرنا بہتر سمجھتے ہیں میں کوئی حکم اس سلسلہ میں نہ دوں گا مسلک واضح کر دیا۔

۲۷ امرداد ۴۵ء

آج ہم میں قائد ملت نہیں ہیں لیکن ان کی تحریر ان کی ہدایت ان کے خطبات اور سب سے بڑھ کر تربیت یافتہ جماعت موجود ہے جو ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔

محمد عبدالہادی صدیقی

مشیّت ایزدی

این ماتم سخت است جواں مرد جواں مرد

قائدِ ملّت محمد بہادر خاں کی موت پر کونسا ایسا دل ہے جو مغموم نہیں اور کونسا ایسا انسان ہے جو رنجور نہیں وہ ایک جلیل القدر اور عظیم المرتبت مسلمان تھے بشیر نیستان دکن اور ضیغم ہندوستان بھی تھے ان کی حیات رحمت اور ان کی زندگی راحت تھی۔ وہ مرے نہیں زندہ ہیں۔ وہ یہاں نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامہ حیات باقی اور احسان تازہ ہیں ان کے کام اور ان کے بیان ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ وہ نہ صرف نام کے بہادر تھے بلکہ کام کے بہادر بھی تھے۔ بلکہ میدان کے بہادر بھی تھے اور بہادر یار جنگ بھی تھے۔ ان کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ ان کی آواز کانوں میں، ان کے خیالات دماغوں میں اور ان کا عمل سینوں میں ہے ان کا بلند و بالا قد ان کی نورانی صورت ان کے قوی بازو ان کا کشادہ سینہ ان کا مضبوط جسم نظروں میں ہے۔ کبھی ان کے ہاتھ میں چھڑی اور کبھی ان کے دونوں ہاتھ جیبوں میں کبھی فرش پر، کبھی تخت پر، استادہ جلسوں میں مجمعوں میں، لاکھوں میں ہزاروں میں مسکراتے لبوں میں قوم کو مخاطب فرماتے۔ للکارتے کہ "اے ایمان والو خدا سے ڈرو رسول کی پیروی کرو" کبھی لرزتے کبھی برستے، کبھی آہستہ اور کبھی آواز۔ شفقت سے محبت سے نرمی

سے، شیریں کلامی سے، میٹھی آواز سے ملّت کو سراہتے، ڈراتے، دھمکاتے کبھی توحید کا نغمہ تو کبھی وحدت کا ذکر فرماتے، کبھی توریت و انجیل کی تحلیل، تو کبھی فرقان مجید کی تفصیل فرماتے۔ کبھی حمد باری تعالیٰ تو کبھی رسالت کے ذکر سناتے۔ کبھی لطفی کی تو کبھی شر کی راہ بتاتے، کبھی فاران کی چوٹیوں پر تو کبھی سینا کی پہاڑیوں کا خطبہ دیتے، کبھی طوفانِ نوح سے ڈراتے تو کبھی طور کے جلوے بتاتے کبھی ضرب کلیم لگاتے تو کبھی دعائے خلیل سناتے، کبھی اسمٰعیل کی قربانی تو کبھی حسین کی شہادت کے سبق پڑھاتے غرض ان سب بیانوں کو ان کی ہدایتوں کو سب نے سنا کونین نے سنا، روحوں نے سنا، انبیا نے سنا، اولیا نے سنا، خدائے قدوس نے سنا غرض ان مقدس ہستیوں کی ان کے نسبت اس بارے میں رائے صائب، اور شہادتیں صادق، گواہیاں راسخ اور فیصلے کامل ہیں چنانچہ ان کے پند و نصائح اور ان کے وعظ اور ان کی خدمت خلق دنیا میں اور بارگاہ باری تعالیٰ میں مقبول ہوئی اور حکم باری ہوا کہ ہم سے قریب رہو، انسان سے فرشتہ بنو، دنیا چھوڑو وہاں کی صدارت سے روحوں کی قیادت سنبھالو بظاہر یہی مشیت تھی کہ انھوں نے باری تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا۔

اب ہم اپنے عمل سے کردار سے، گفتار سے اس تنظیم کو، اس تعمیر کو جس کے نقوش اور جس کی بنیادیں مرحوم نے دنیا میں چھوڑیں مضبوط بنائیں اور برقرار رکھیں اور قوم و ملّت کی خدمت سے خدا کو، رسول کو اور مرحوم کو خوش رکھیں کہ یہی حیاتِ ابدی ہے۔

از :- جناب سید حسن صاحب (عثمانیہ)

بہادر خاں مجاہد وطن

بہادر خاں کی موت ایک بہادر سپاہی کی موت ہے۔ اس مجاہد وطن نے کبھی ہتیار نہیں ڈالے۔ اس نے لڑتے ہوئے جان دی اور موت کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے حیدرآباد کے سیاسی دھارے کا رخ بدل دیا۔

گزشتہ ڈیڑھ صدی سے حیدرآباد کے سیاسی اور معاشی بہاؤ کی راہیں حکومت ہند متعین کرتی تھی یہاں کی سیاسی اور معاشی زندگی پر حکومت ہند کے اثرات اس درجہ غالب رہے ہیں کہ حیدرآباد کا مسلمان جو اپنے آپ کو سلطنت آصفیہ کا پہلا خادم سمجھتا تھا۔ انگریزوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو پست محسوس کرنے لگ گیا تھا۔ حکومت ہند کا رعب اس کے دماغ پر بری طرح طاری تھا۔ برطانوی مداخلت کو بڑھتا ہوا دیکھ کر وہ اس کے لیے راستہ ہموار کرنے لگا تھا۔ اگر اسے کوئی ٹوکتا تو جواب میں کہا کرتا تھا۔ کس کا مقابلہ کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں کہ الور، اندور، نابھا حتیٰ کہ امان اللہ خاں کا کیا حشر ہوا؟ اس کے جواب کو سن کر برطانوی مداخلت کے خلاف دبی زبان سے احتجاج کرنے والے خاموش ہو جاتے تھے۔ اور حیدرآباد کی دنیا برطانیہ کی غلامی کی قدیم ڈگر پر چلی جا رہی تھی۔ جب حیدرآباد کا مسلمان جو اپنے آپ کو مختلف وجوہ سے دولت آصفیہ کا پہلا خادم تصور کرتا تھا۔ اس طرح رزیڈنسی سے

راضی بہ رضا کا عہد کر چکا تھا۔ آصف جاہ کی غیر مسلم رعایا سے یہ توقع کہ وہ مداخلت کے خلاف آواز بلند کرے گی اس وجہ سے صحیح نہیں ہو سکتی تھی کہ غیر مسلم عناصر تجارت، ساہوکاری، صنعت و حرفت اور زراعت میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ انقلابی سیاسیات کو ان کی معاشی مصروفیات میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ جب حکومت مفلوج ہو چکی اور رعایا کے دونوں فرقے یعنی ہندو اور مسلمان عالم تعطل میں زندگی گزارنے لگے تو کیا توقع ہو سکتی تھی کہ حیدرآباد کبھی سربلند بھی ہو سکے گا۔ بہادر خاں نے اسی سیاسی پس منظر میں جنم لیا۔ انھوں نے سیاسی میدان میں قدم رکھا تو انھیں معلوم تھا کہ حیدرآباد کے لیے سب سے پہلے عوام کی متاع عزیز یعنی مذہب کو خطرے میں بتلانا ضروری ہے۔ چنانچہ حیدرآبادیوں سے بہادر خاں کا پہلا تعارف ایک واعظ کی حیثیت سے ہوا۔ چند سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ بعض کوتاہ اندیش آریہ سماجیوں نے نام نہاد شدھی گرہ کی تحریک کا آغاز کر کے بہادر خاں کو حیدرآباد کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کا موقع دیا۔ ظاہر بین اشخاص نے سمجھا کہ بہادر خاں کو اپنے ہندو برادرانِ وطن سے بیر ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ بہادر خاں کو اہل ہنود سے نہ کوئی بیر تھا اور نہ کوئی خوف بہادر خاں نہ ان کی نام نہاد اکثریت سے مرعوب تھے اور نہ ہندو کارکنوں کے منتشر نعروں سے پریشان ہوتے تھے۔ ان کا اولین مطمع نظر یہ تھا کہ حیدرآباد کے مسلمانوں کو اس نظریہ سے ٹکرا دیں جو پارلیمنٹیسٹی کے نام سے حیدرآباد کے سیاسی اور معاشی دنگل کو مضمحل اور معطل کیے ہوئے تھا۔

بہادر خاں جانتے تھے کہ جس روز حیدرآباد کے مسلمان اس

ایقان کے ساتھ خم ٹھونک کر تیار ہو جائیں گے نتیجتہً حیدر آباد صحیح معنوں میں خود مختار اور برطانیہ کا حلیف بن سکے گا۔ بہادر خاں جانتے تھے کہ جب ہندو اور مسلمان کسی میدان میں اپنی دو صد سالہ روایات کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہو جائیں گے تو لڑاؤ اور حکومت کرو والا ہتھیار بھی بے اثر ثابت ہوگا۔ یہ تھا اس شخص کا نصب العین جس کی ہم آج یاد منا رہے ہیں زندگی میں حیدر آباد کی سلامتی کے لیے۔ بہادر خاں کو بالکل نہیں پہچانا۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک متعصب مسلم لیگی کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس کا منشاء صرف مسلمانوں کو بیدار اور منظم اور آمادۂ جہاد کرنا تھا۔ بہادر خاں کو یقین تھا کہ ان کو ہندو حلقوں سے بروقت کمک ملے گی۔ آپ یہ بھی سن لیجئے کہ انھوں نے مسلمانوں کو مجاہد بنانے کے لیے کیا صورتیں اختیار کیں۔ سب سے پہلے انھوں نے مسلمانوں کے قلوب سے حکومت کا رعب زائل کرنے کی کوشش کی۔ جب یہ کوشش کامیاب ہو گئی تو انھوں نے مسلمانوں کے دلوں کو انگریزوں کے خوف سے خالی کر دیا۔ یہ منزل بھی طے ہو چکی تھی۔ اب ان کا تیسرا قدم شاید تھا کہ ہندو کارکنوں سے کوئی قابل عمل اور باعزت سمجھوتہ کر کے اپنی زندگی کا اصلی مشن شروع کر دیں لیکن مشیت یہی تھی کہ بقیہ کام ان کے جانشین پورا کریں۔ بہادر خاں یکایک فوت ہو گئے لیکن حیدر آباد میں انھوں نے برطانوی مداخلت کے خلاف جہاد کے لیے زمین ہموار کر دی۔ فوج آراستہ ہو چکی ہے اور عوام آزادی کے جذبہ سے بیتاب ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جو ان کی جگہ لے اور بہادر خاں کے مشن کو آگے بڑھائے۔ بہادر خاں بیشک مر چکے لیکن مجاہد وطن ہنوز زندہ ہیں۔ مجاہد وطن زندہ باد۔

از: مسٹر سید احسن اشرف منشی فاضل
(پنجاب و حیدرآباد)

مردِ مومن۔ بہادر خاں

کسے معلوم تھا کہ نواب بہادر یار جنگ بہادر اس کاروباری عالم کی ہنگامہ آرائیوں سے اس قدر جلد اکتا جائیں گے۔ یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کے متعلق انسان کچھ نہیں سوچ سکتا۔ اس کا دماغ اس قابل نہیں کہ کوئی قطعی رائے قائم کر سکے۔ انسانی زندگی کی بے بال و پری پر واقعی رونا آتا ہے مگر کیا کیا جائے "مجبور" ہیں مگر اختیار کسے ہیں یہ بھی آج تک کسی نے نہ جانا اور وہ ساری باتیں جن کا نہ ہونا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ بہر حال اپنے وقت پر پوری ہو کر رہتی ہے۔ قائدِ ملت کی موت بھی ان ہزاروں باتوں میں سے ایک ایسی ہی بات ہے جو فطرت کے ہاتھوں چپکے چپکے پائی اسے اتفاق پر محمول کریں یا کسی اور چیز پر مگر ایسا ہونا ضروری تھا، اور یہ ہو کر ہی رہا کہا جا سکتا ہے کہ ان کی موت قبل از وقت ہوئی پھر بھی مشیّت کی رو سے ان کی ہستی وقت کے لیے اٹل تھی۔ ایسی صورت میں لفظ "فانی" ہمارے لیے کوئی نیا نہیں۔ اس کی جان پہچان تو بہت پرانی ہے تو پھر ہم ان چیزوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی انجان بن کر کیوں گلے شکوے کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا اس لیے کہ کھوئی چیز پھر سے مل جائے گی! سچ بات تو یہ ہے کہ

فطرت کسی چیز کو چھین لینے کے بعد لوٹاتی نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ قائد ملت کے اٹھ جانے کی وجہ سے اس بھری محفل میں ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا جس کے پُر ہونے کی اب کوئی امید نہیں۔ اور اب وہ رونق جاتی رہی جو محض قائد ملت ہی کے دم کا نتیجہ تھا۔ محفل کا سونا پن ہمارے احساسات و جذبات میں جو ہل چل پیدا کر دیتا ہے وہ قائد ملت کی اس اعلیٰ شخصیت کا ایک ادنیٰ سا پرتو ہے۔ جو ہر حال ہماری اجتماعی زندگی پر بے چین کروٹیں لیتا رہے گا قائد ملت کی ہمہ گیر مقبولیت و ہر دلعزیزی کا راز ان کی سچائی اور ان کے خلوص میں چھپا ہوا تھا۔ اکثر و بیشتر ان کی یہ سچائی کڑوی ہو جایا کرتی لیکن ان کے اخلاص کے مسلسل اثرات کی وجہ سے بعد میں یہ کڑوا پن شکر کی مٹھاس میں بدل گیا اور ہر شخص انفرادی حیثیت سے خوب دل کھول کر داد دینے لگا جس کی صحیح لذت سے یہ اب تک ناواقف تھا۔ قائد ملت کی یہ پہلی کامیابی اس حقیقی مقام کا پیش خیمہ تھا جس پر پہنچنے والے تھے۔ اس طرح یہ عجیب انسان چپکے چپکے ہر شخص کے دل میں گھر کرتا گیا لیکن کسی کو خبر نہ ہوئی عوام کی زندگی سے ان کا رشتہ بہت مضبوط تھا جس کا ٹوٹنا ایک محال بات تھی اور اس حیثیت سے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ قائد ملت نفسیات کے ایک اچھے ماہر تھے اور یہی وہ کلید ہے جس سے ان کی پبلک زندگی کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑ لیا تھا اور جان گئے تھے کہ مسلمانوں کی بے راہ روی مذہبی غفلت کا ایک نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنے ہر انداز سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ باہمی اتحاد اور پیہم کوشش ہی زندگی کا صحیح مول ہے اور اسی لیے انھوں نے اقبال کے مشہور شعر سے

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں

کی زبان میں وہ انمول پیام دیا جو اجتماعی زندگی کے لیے بجا طور پر باعث فخر ہے۔ قائدِ ملّت کی زندگی اقبال کے کلام کی ایک تفسیر ہے۔ ان کا کردار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام سانچوں میں ڈھل کر وہ صورت اختیار کر گیا جسے ہم قرآنی زبان میں مردِ مومن کا کردار کہہ سکتے ہیں یہ وہی مردِ مومن ہے جس کو حضرت اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعہ سے روشناس کرایا یا ان کی زندگی کا نہج ہی کچھ ایسا تھا کہ اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا ایک ناکام کوشش سے کم نہیں۔ پھر بھی وہ باتیں جو ہمارے لوحِ دل پر مرتسم ہیں اپنا راستہ نکالے بغیر نہیں رہتے۔ ملّت سے محبت کرنے والا یہ انسان جو سوچتا تھا وہ کہتا تھا جو کہتا تھا اسے کر دکھاتا تھا ان کا ارادہ اور عمل ایک ایسی مضبوط ڈور سے بندھا ہوا تھا جسے بڑی سے بڑی قوت بھی نہ توڑ سکی، وہ اپنے ہی رنگ کے ایک ہی فرد تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہندوستان کے لیڈروں میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ اسی خدمات قومی کے سلسلہ میں انھیں جن جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیل ایک مستقل بحث چاہتی ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ انھوں نے ملک و ملّت کے فائدے کے لیے اپنے ذاتی مفادات کو قربان کر دیا۔ ان کے میٹھے بول میں جو طلسم تھا اس کا اعتراف ہمارے بس کی بات نہیں۔ ان کی موت سے نہ صرف اردو زبان کے شعبۂ خطابت کو ایک دھکا لگا بلکہ مسلمانانِ عالم کو جو ٹھیس پہنچی اس کی چبھن نہ معلوم کتنے دنوں تک باقی رہے گی۔

اس وقت قائدِ ملّت مرحوم کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

لیکن دنیا میں صرف ماتم ہی سے کام نہیں چلتا۔ ع

آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

اگر قوم ان کی یاد تازہ رکھنا چاہتی ہے تو تو چاہیئے کہ ان کی یادگاریں قائم کرے۔ نواب صاحب کا مسلک ان کی تحریروں اور تقریروں میں اچھی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ جو اپنی صداقت اور معنوی اعتبار سے ایک دعوت فکر ہے اگر مسلمانوں نے اپنی تنظیم کو قائم رکھا اور اسے تقویت پہنچائی تو اس انجان مقام پر جانے والے خاموش مسافر کی روح مسرت اور کامرانی سے کس قدر مالا مال ہو جائے گی اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

از:۔ مسٹر سید سجاد محسن

ملت کا شب چراغ

اس دنیائے فانی میں بقائے دوام کا تصور ہی غلط ہے۔ ہر شے کا وجود اس کی فنا کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہم پیدا اسی لیے ہوئے ہیں کہ مر جائیں سب ہی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے جاتے ہیں یہ اس کارزار ہستی کا پرانا دستور ہے لیکن پیدا ہونے اور مرنے کے اس وقفہ میں ہم کو کیا کرنا چاہیئے اس امر سے واقف ہونا اور اس سے زیادہ اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کہ ہر شخص کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ زندگی

کی اس دوڑ میں دنیا کو خواہ وہ علمی ہو یا عملی ترقی کی ایک انتہائی منزل پر پہنچا دے یوں تو ہر شخص انفرادی یا کسی چھوٹے ادارے یا جماعت کے مفاد کی حد تک کچھ نہ کچھ کام ضرور کر لیتا ہے لیکن ہر زمانہ میں بنیادی اور تعمیری کام کرنے والا اور صحیح معنوں میں قیادت کرنے والا صرف ایک شخص ہوا کرتا ہے اس کو جاننا پہچاننا اس کی رہبری پر عمل کرنا اس کے پیغام اور اشارات کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنا یہ قوم کا کام ہے تاریخ آج بھی ایسے قوم کے انسانوں سے خالی نہیں ہے جو اپنے صحیح رہنما کو نہ پہچان سکے۔ اور اس کے پیام کو بھلا کر قعر مذلت میں گر پڑے۔

قائد ملت مرحوم نے حیدرآباد کی قومی اجتماعی زندگی میں جو تعمیری کام کیا ہے جن کی وجہ سے آج ہم اپنے میں سیاسی شعور اور بیدار پاتے ہیں اور ان کی سعی و کاوشوں کا اظہار کرنا اس وقت بے سود ہے۔ ہم اب تک ان کی اس بے وقت موت اور جوانمرگی پر کافی آنسو بہاتے رہتے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ آہ و بکا اور گریہ و زاری کے اس بے پناہ سیلاب میں ان کے بتائے ہوئے راستہ کو بھول جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اس بے وقت موت سے ناقابل تلافی نقصان ضرور ہوا ہے۔

لیکن جہاں تک ہمارا بس چل سکتا ہے اس میں کوتاہی عمل سے کام لینا خطرناک مستقبل کو دعوت دینا ہے۔ یہ ہمارے بس میں ہے کہ ان کا بتلایا ہوا راستہ اختیار کریں اور ان کی حرارت ایمانی کو اپنے سینوں میں منتقل کر لیں ملت کی خاطر جینا اور مرنا سیکھ جائیں۔ دین میں نفاق اور انتشار نہ پیدا ہونے دیں۔ قائد ملت کے انتقال کے بعد ملت اسلامیہ حیدرآباد کی موجودہ بے راہ روی

ایک تاریک مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

مرحوم کی زندگی ہمارے لیے نمونۂ عمل ہے اور خاص طور پر ان کے جیسے جذبۂ ایثار رکھنے والوں کا ہندوستان میں بڑی حد تک فقدان ہے ایک اور خصوصیت جو ان کو ہندوستان کے اور لیڈروں سے الگ کرتی ہے وہ ان کا جذبۂ ایمانی ہے۔ وہ اقبال کے خوشہ چینوں میں سے تھے وہ اقبال کے تصور کے مطابق خیر البشر تھے۔ خدا کرے کہ ہمارے نوجوان ان کے سے بلند ارادوں اور وسیع عزائم کے حامل بن جائیں۔ ملت کے مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو بھول جائیں اور ان کی سی دینوی محبت اپنے دلوں میں پیدا کر کے اپنی بھولی ہوئی زندگی کو یاد کر لیں۔

قائد ملت کی قومی زندگی کی ایک خصوصیت جو بہت نمایاں ہے وہ ان کی ہر دلعزیزی ہے جو انھوں نے بہت جلد اور کم عرصہ میں حاصل کی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی گئے اور جس صوبے میں گئے اس نے اس بلبل ہزار داستان کو اسیر کرنا چاہا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی سحر بیانی ہے۔ تقاریر میں جادو کا اثر تھا، اور اثر اس لیے تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اپنے دردمند دل کی عمیق گہرائیوں سے کہتے تھے اور ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ لیکن افسوس کہ ان کی موت زبان اردو میں خطابت کی موت ہوگی۔

قائد ملت میں بڑی خوبیاں تھیں ملت کے مفاد کے خاطر انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اپنی جاگیر اور خطاب کی پرواہ نہ کی۔ جھوٹے اور بے سروپا اتہاموں کو سنتے رہے، نادان دوستوں سے بھی بھلائی کی

اور دانا دشمنوں سے بھی۔ ہمارے دکھ درد کو اپنا سمجھا، انھوں نے ہم سے بھلائی کی خدا اور رسول ان سے خوش ہو۔ افسوس کہ وہ بہت جلد ہم سے منہ موڑ گئے ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

از :- جناب عزیز احمد بی اے مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل فوڈ پروڈکٹس لمیٹڈ
و معتمد مرکزی مجلس مسلم تاجرانِ مملکت آصفیہ

تاجروں کے مصلح

زعیم ملت نواب بہادر یار جنگ علیہ الرحمہ کے غیر معمولی اوصاف کا ذکر اکثر پیاماتِ تعزیت میں کیا گیا۔ ملک اور بیرونِ ملک کی کوئی ایسی بڑی شخصیت نہیں تھی جس نے مرحوم کے بے مثال ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کو خراج تحسین نہ ادا کیا۔ ان سب پیامات میں سے صرف مسز سروجنی نائیڈو نے ایک ایسا جامع اور مانع جملہ استعمال کیا ہے جو نواب مرحوم کی پوری شخصیت پر حاوی ہے۔ موصوفہ نے فرمایا کہ "وہ پیدائشی لیڈر تھے"۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں قیادت کی ایسی ذہنی خصوصیات ودیعت کی گئیں تھیں کہ سعی و کوشش سے بہ مشکل حاصل ہو سکتی ہیں۔ نہ صرف ان کا زورِ خطابت ہی خداداد تھا بلکہ ان کے

فکر و عمل کی جامعیت و ہمہ گیری محض عطیۂ الٰہی تھی۔

ایک حقیقی قائد و زعیم جو کسی قوم کی احیاء کے لیے مامور کیا گیا ہو اس کی اصلاح کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ نواب صاحب نے مسلمانوں کی مجموعی فلاح کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ جہاں انھوں نے سیاست اور مذہب کا علم بلند کیا تھا وہاں معاشرت اور معیشت کے اہم مسائل کو بھی فکر و توجہ کا مرکز بنایا تھا۔ ایک طرف وہ سیاسی اکھاڑہ میں نبرد آزما نظر آتے ہیں تو دوسری طرف قرآن و حدیث (جن کو وہ بصیرت آمیز طریقہ پر ہماری سیاست کا منبع سمجھتے تھے) کے حیات آفریں نکات پر ذریا بہائے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک جانب ملت کی معاشرتی صلاح میں مصروف ہیں تو دوسری جانب معاشی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے میں مشغول ہیں۔

راقم الحروف کا بحمد اللہ تعلق تاجروں کے طبقہ سے ہو گیا ہے اس لیے یہاں نواب صاحب کی ان کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے مسلم تجار کی اصلاح و ترقی کے لیے صرف فرمائی تھیں۔ مرحوم نے اس طبقہ کی اہمیت اور اس کی ترقی کی ضرورت کا کما حقہ اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ بجا طور پر یہ فرماتے تھے کہ تجار قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ مجلس اتحاد المسلمین کے سرمایہ میں تاجروں نے جو بیش بہا حصہ لیا تھا اس کا وہ ہمیشہ قدر دانی کے ساتھ ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ان کی فکر و عمل کا کافی حصہ اس طبقہ کے استحکام پر صرف ہوا تھا وہ مسلمان تاجروں کا ایک مضبوط اور ترقی پذیر نظام دیکھنے کے لیے بڑے متمنی تھے۔ نہ صرف انھوں نے بعض تاجروں کو

ان کے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے فرداً فرداً اپنے غیر معمولی اثر سے کام لیا بلکہ اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے بہت کوشاں نظر آتے تھے۔ انتقال سے چند روز قبل انھیں مرکزی مجلس تاجران کے ایک جلسہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ نواب صاحب نے بہت مسرت کے ساتھ اس دعوت کا خیر مقدم فرمایا اور تشریف لاکر دو ڈھائی گھنٹہ تک اپنے گرانقدر ارشادات سے مستفید فرماتے رہے۔ انھوں نے اپنی اس دلی تمنا کا بہت ہی موثر اور پُرزور الفاظ میں اظہار فرمایا کہ حیدرآباد کے مسلمان تاجر باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لے کر ایک ایسے منظم اور مستحکم نظام کی بنیاد ڈالیں جو ان کی اجتماعی فلاح و ترقی میں ممد و معاون ہو۔ دوسری قوموں میں ایسی تنظیمیں بکثرت موجود ہیں۔ وہاں نہ صرف ایک بڑے فرقہ کے لیے بلکہ تاجروں کے چھوٹے چھوٹے طبقوں کے لیے علیحدہ نظام فرقہ واری نام کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اور مسلمان اس قسم کی وسیع تنظیم کے برکات سے محروم ہیں۔ نواب صاحب نے ایک اعلیٰ تنظیمی ادارہ کے قیام پر بہت زور دیا جس کے تحت جملہ تاجر اپنی شیرازہ بندی کر کے اپنے موقف کو مضبوط اور مستحکم کر سکیں۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ وہ دن ان کے لیے بڑی مسرت کا ہوگا جب وہ سنیں گے کہ حیدرآباد میں ایک مسلم ایوان تجارت قائم ہو چکا ہے۔ جب حاضرین جلسہ نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا تو نواب صاحب نے قبل از قبل مبارک باد بھی دے دی۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ دوسرے طبقوں کی طرح تاجروں کی فلاح و بہبودی کی فکر میں بے چین رہنے والا یہ معلمِ اعظم اس وقت مبارکباد دینے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ جب کہ واقعی سب تاجر اپنے کو متحد و منظم

کر کے (جس کی کوشش جاری ہے) ایک باوقار ایوان تجارت قائم کریں گے۔
بہادر یار جنگ کے ملک پر بڑے بڑے احسانات ہیں کیا جماعتیں
کیا افراد سب نے ان کے فکر و عمل کی خداداد قوتوں سے زیادہ سے زیادہ
فائدہ اٹھایا ہے۔ قوم کا کوئی طبقہ ایسا باقی نہیں رہا جس کو اصلاح و ترقی
کے لیے انھوں نے پیہم جدوجہد نہ فرمائی ہو۔ ان کی مصلحانہ کوششوں سے
طبقہ تجار بھی مستفید ہوا اور وہ اپنی وفات سے قبل ایک ایسا روح پرور
نصب العین مقرر فرما چکے تھے جس پر استقامت کے ساتھ چل کر ہم اور
سربلند ہو سکتے ہیں۔ دینی اعتبار سے ایک مسلمان کے لیے تجارت سے زیادہ
کوئی دوسرا ذریعہ معاش باعث سعادت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ
خاص سنت نبوی ہے۔ اسوۂ حسنہ کے اس عملی اتباع کرنے والوں کی اصلاح
ترقی پر توجہ فرما کر نواب صاحب نے اپنے بے شمار اعمال صالحہ میں جو اضافہ
فرمایا تھا اس سے یقین ہے کہ انھیں فردوس بریں کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام سرفراز
فرمایا گیا ہوگا۔

(ادارۂ آہنگ ہفتہ وار

وہ آواز

زندگی پیہم انقلابات کا نام ہے۔ انقلابات جس کی ہر کروٹ میں
تعمیری و تخریبی عناصر کارفرما ہوتے ہیں جن کے سائے میں زندگی کبھی مسکرا

اٹھتی ہے اور کبھی اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں جہاں اس کے بنانے اور سنوارنے میں تقدیر کو بڑا دخل حاصل ہے وہاں وہ خود انسانی تدبیر کی بھی رہین منت ہے۔

آدم سے لے کر اس وقت تک انسان کی تمدنی اور سیاسی زندگی مسلسل انقلابات سے گزری ہے اور ان انقلابات میں اس نے اپنی زندگی کو بنانا اور بگاڑنا سیکھا۔ حضرت آصف جاہ اول سے لے کر حضرت آصف جاہ سابع کے دور حکومت حیدرآباد کی یہ علیحدہ وحدت سیاسی ہچکولے کھاتی رہی اور خاص طور پر مسلمان جو تمدنی، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے اپنے علیحدہ تصورات رکھتا ہے ڈھائی تین سو سال سے بہت خسارہ میں رہا۔ حیدرآباد کا مسلمان اپنی ایک علیحدہ تنظیم کے لیے جس کے سہارے وہ اپنی دنیا کو روشن بنا سکے جس سے واقف ہو کر وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے قریب تر ہو جائے وہ منتظر رہا۔ ایک ایسی آواز سننے کے لیے جو اس کے قلب کو گرما دے جو اس کی روح کو تڑپا دے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے ایک ایسی ہی آواز حیدرآباد کی فضاؤں میں گونجی۔ آواز اس مرد مجاہد کی آواز جس نے حیدرآبادی مسلمانوں کو جینے کے طریقے بتائے جو سے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز رکھتا تھا

جس نے علامہ اقبال کے ان شاہی بچوں کو جن کو کرگس گھیرے ہوئے تھے خود آگہی کے آداب سکھائے۔ یہ آواز حیدرآباد کے مسلمانوں کے خواب کی تعبیر تھی۔ جسے سن کر ان کے دلوں میں زندگی کی نئی امنگیں

کروٹیں لینے لگیں اور سب ایک ساتھ پکار اٹھے ہمیں وہ سب کچھ مل گیا جس کی ایک مدت سے ہمارے دلوں میں تمنا تھی۔

بہادر خاں مرحوم و مغفور کے نام سے ہندوستان کا کون ایسا مسلمان ہے جو واقف نہیں اور حیدرآباد کا کون ایسا مسلمان ہے جس پر اس محترم ہستی کے احسان نہ ہوں عظیم تر احسان جن سے عہدہ برآ ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جس مرد مجاہد کی زندگی کا واحد نصب العین جس کی زندگی کی پوری توانائیاں حیدرآباد کے مسلمانوں کے لیے وقف ہوں۔ ایک ایسا رہنما جس کی قیادت نے حیدرآباد کے مسلمانوں کے تعطل و جمود کو حرکت میں تبدیل کر دیا، اور سچ پوچھا جائے تو حیدرآبادی مسلمانوں کی آج کی سیاسی بیداری اسی امینِ حریت کی رہین منت ہے۔ آج کا حیدرآبادی مسلمان اپنے سینے میں ایک عزم رکھتا ہے جو بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرا کر اس کی قوت کو پارہ پارہ کر ڈالے، ایک ایسے اٹل ارادے کا حامل ہے جس کے سامنے زندگی کی کوئی مشکل بھی مشکل نہیں۔ ایسے محسنِ اعظم اور اس کی خدمات کو فراموش کرنا کسی بھی قوم کے لیے انتہائی بدبختی ہے۔ اس کی آنکھ آج بھی بطل حریت کو یاد کر کے اشکبار ہو جاتی ہے اس کا دل آج بھی سوگوار ہے، سوگوار اپنی ایک عزیز ترین ہستی کے لیے، عزیز ترین ہستی جس کی آواز اس سے دور بہت دور ماوراء کی لامحدود پنہائیوں میں آج بھی اس کے لیے بے قرار ہے۔ آہ وہ آواز۔

ارشادِ شاہانہ

ان کی خدمات ان کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔
ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ حضور اقدس نے فرمایا کہ یہ بڑا نازک زمانہ ہے اور یہ وقت ان کی خدمات کا تھا۔ جو کام انھوں نے قوم و مذہب کے لیے انجام دیئے وہ ان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ رکھیں گے۔ انسان کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ سینکڑوں برس صبح و شام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے۔ جو اپنی صفات اور خدمات کی وجہ سے قوم میں ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔ تین برس پہلے بھی ان کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے ان کو زیادہ محنت نہ کرنے کی نصیحت کی تھی انہیں اس وقت حلق کا مرض تھا۔

یاد تازہ رکھو:۔ بندگان عالی نے ارشاد فرمایا کہ اب تم لوگوں کا یہ ایک ہی کام ہے کہ بہادر یار جنگ کی خدمات کی قدر کرو اور ان کی یاد تازہ رکھو۔ میت کا چہرہ دیکھ کر فرمایا کہ بیماری کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ اگر یہ چھ مہینے بھی بیمار پڑتے تو کھل نہیں سکتے تھے۔ ان کی صفات سب کو معلوم ہیں اور سب پر ظاہر ہے۔ ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں یہ وقت آہ و زاری کا نہیں صبر کا ہے۔ مرتے سب ہیں لیکن ایسی موت جو وقت سے پہلے ہوتی ہے بیشک جانکاہ ہوتی ہے موت سب کے لیے ہوتی ہے۔ امیر و غریب، شاہ گدا کسی کو اس سے مفر نہیں دنیا میں انسان باقی نہیں رہتا

لیکن اس کے اوصاف باقی رہتے ہیں۔

ان کے کام کو پورا کرو:۔ جو چیز انھوں نے چھوڑی ہے اس کو زندہ رکھو جس کام کو انھوں نے شروع کیا تھا اس کو پورا کرو۔ انھوں نے اپنے مذہب و ملت کی بڑی خدمت کی بڑا کام کر گیا۔

انقلاب کو گذر جانا چاہیئے تھا:۔ یہ بھی ارشادِ شاہانہ ہوا کہ یہ زمانہ بڑا نازک ہے اس انقلاب کو گذر جانا چاہیئے تھا مولوی ہاشم علی خاں صاحب رکن ہائیکورٹ بھی تھے جن کے مکان میں قائدِ ملت کی روح پرواز ہوئی ان سے بندگان عالی نے تفصیلات دریافت فرمائیں استفسار ہوا کہ نماز جنازہ کہاں ہوگی ان کی بیوی سے پھر ملوں گا یہ فرماتے ہوئے بندگان اقدس آگے بڑھے لیکن سیڑھیوں کے قریب فرمایا کہ کیا اس جگہ ان کی بیوی ہیں۔ حضور اقدس زنانے میں تشریف لے گئے ایک عجیب دردناک منظر تھا جب کہ بیوی قدوم شاہانہ سے لپٹ گئیں درد میں ڈوبی ہوئی چیخوں سے ہر قلب پاش پاش ہو رہا تھا۔ ذات شاہانہ بیوہ بیگم کو دلاسا دے کر موٹر میں سوار ہوئے پون گھنٹہ تک۔ ذات شاہانہ میت کے پاس رہے۔

ہر ہائنس پرنس آف برار کا تعزیتی پیام

اس افسوسناک اطلاع کو سن کر بے حد ملال ہوا، ازراہ مہربانی اس صدمۂ عظیم میں آپ میری پُرخلوص ہمدردیوں کو قبول فرمائیے۔

شہزادی صاحبہ برار کا تعزیتی برقیہ

ہز ہائنس پرنس آف برار شہزادی دُرِ شہوار نے قائد ملت کی وفات پر اُدٹی سے بیگم قائد ملت کے نام برقیہ روانہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ عمیق احساسات رنج کے ساتھ میں نے یہ افسوسناک خبر سنی اس سانحہ عظیم میں تمہارے ساتھ میری ہمدردیاں ہیں۔

شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کا تعزیتی تار

علیاحضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے بیگم قائد ملت کو اپنے برقیہ میں فرمائی ہیں کہ بہادر خاں کے انتقال کی خبر میں نے گہرے رنج کے ساتھ سنی تمہاری اس مصیبت عظمیٰ میں میری ہمدردیاں بھی شامل ہیں۔

شہزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ کا پیام تعزیت

عزیزم بیگم بہادر خاں۔ ہمیں آپ کے سانحہ عظیم کی خبر مسوری میں ملی نہایت رنج و محن ہوا مرحوم کی بے لوث زندگی اور جوانمرگی کا ملک ماتم کر رہا ہے اور کوئی فرد بشر اپنے احساسات کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور نیز جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پیامِ علیا حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ

مرحوم کی ہستی وہ کیا ہستی تھی جس کا زمانہ انتظار کرتا ہے وہ ایک حق شناس، حق گو اور حق پرست انسان تھے الحمد کہ ان خصوصیات کا اعتراف ان سے اختلاف رائے رکھنے والے تک کرتے تھے۔ ان کی بے وقت اور ناگہانی موت کے باعث بے حد رنج و ملال ہے گو ہم ان کی جادو بیانی سے اب محروم ہو گئے ہیں لیکن ان کا نمونہ زندگی عوام کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

سر صدر اعظم بہادر دولتِ آصفیہ کا تعزیتی پیام

ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری کرنل حافظ سر احمد سعید خاں صدر اعظم بہادر دولت آصفیہ نے بیگم قائدِ ملت کی خدمت میں حسب ذیل تعزیتی پیام روانہ کیا ہے۔ آج آپ جس المناک حادثہ سے دوچار ہیں بیان نہیں کر سکتا کہ میں اس سے اس وقت اپنے آپ کو کس درجہ متاثر پا رہا ہوں۔ دیرینہ روابط کی بناء پر مجھے مرحوم کی خدمت میں جو نیاز حاصل تھا، اس سے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور جب ان کی روح مقام اعلیٰ پر پہنچ چکی ہے۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی بلند سیرت وسیع القلبی اور ثبات عزم کے کس قدر گہرے نقوش میرے قلب پر مرتسم ہیں۔ ایک مرحلہ تک مرحوم کی خدمات کا حق ادا کرنے کے بعد آپ کا آج دفعتاً اس سے محروم ہو جانا ہر طبقہ میں بجا طور پر آپ کے لیے ایک صدمۂ عظیم سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح مرحوم کے بے شمار احباب اور ملنے والوں

کی مانند میں ان کے سانحہ ارتحال کو اپنے لیے ایک ذاتی نقصان تصور کرتا ہوں لیکن اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ مرحوم ملک کے فدائی اور مالک کے سچے جاں نثار تھے جن کی بے وقت وفات نے حیدرآباد کے علمی اداروں مجلسی حلقوں اور پبلک لائف میں ایک ایسا خلاء پیدا کر دیا ہے کہ اس کا آسانی سے پُر ہونا مشکل ہے۔ اس موقع پر غالباً مجھے آپ کو یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کی اس مصیبت میں میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو اور مرحوم کے جمیع اعزہ اور پسماندگان کو توفیق صبر اور مرحوم کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

بیگم صاحبہ نواب صاحب چھتاری

ناسازی مزاج کی وجہ سے بڑا افسوس ہے کہ میں آج آپ کے تعزیتی جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتی لیکن میری دلی ہمدردیاں آپ کے اور اس جلسہ کے بانیوں کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو جنت نصیب کرے اور پسماندوں کو صبر دے۔

بلبل ہند کے تاثرات

ان کے اچانک انتقال کی خبر نے مجھے سراپا حیرت بنا دیا اور جو صدمہ مجھے پہنچا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ مجھے ماں کہہ کر پکارتے تھے اور ہم دونوں میں

بے حد اخلاص اور محبت تھی۔ اور میں نے ہمیشہ انھیں ان معدودے چند ہستیوں میں شمار کیا جو قیادت کی فطری اور پیدائشی صلاحیتوں کی مالک سمجھی جاتی ہیں۔

سر آرتھر لوتھیان رزیڈنٹ حیدرآباد کا پیام تعزیت

ابھی میں حیدرآباد واپس ہوا ہوں دوران سفر میں عمیق رنج و ملال کے ساتھ یہ اندوہناک خبر سنی کہ آپ کے شوہر کا اچانک انتقال ہوگیا جس کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اپنی قوت کے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ ان کی بے وقت موت ملک اور قوم کے لیے ایک صدمۂ عظیم ہے۔ مہربانی سے میری ہمدردیاں اس صدمۂ عظیم میں قبول کیجئے۔

آنریبل غلام محمد وزیر مال حکومت آصفیہ سابق گورنر جنرل پاکستان

آنریبل غلام محمد نے فرمایا یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مسٹر گریگسن وزیر داخلہ حکومت آصفیہ کا پیام تعزیت

حیدرآباد۔ ۲۴ امرداد۔ آنریبل مسٹر گریگسن اوٹی سے کل تشریف لائے۔ آنریبل موصوف نے قائد ملت کی وفات پر بڑے افسوس کا اظہار کیا۔

آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر صدر المہام تعمیرات کا پیام تعزیت

نواب بہادر یار جنگ کے اچانک انتقال سے جو ناقابل تلافی نقصان ملک کو پہنچا ہے وہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے تمام ملک آپ کا شریک غم ہے۔ مرحوم کی ہستی غیر معمولی ہستی تھی جس پر حیدرآبادیوں کو ناز ہے۔ ان کی فن خطابت میں سحر البیانی، ان کا بے لوث کریکٹر بے نظیر تھا۔ ان کے شخصی تعلقات بلالحاظ مذہب وملت سب سے مخلصانہ تھے افسوس کہ ایسا شخص ہم سے چھین لیا گیا جس سے ملک کو بڑی امیدیں تھیں۔ میں اور میری رانی اس سانحہ میں آپ کے شریک ہیں خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نواب مرزا یار جنگ ایجنٹ برار کا پیام تعزیت

جس وقت نواب مرحوم کے انتقال کی جانکاہ خبر ہم کو معلوم ہوی میری بیگم صاحبہ اور مجھ پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ جو لہریں اسلامی دائرہ کے سمندر میں انھوں نے قائم کردی ہیں ان کا دور مسلسل قائم رہے گا۔ اور وہ لہریں مرحوم کی یاد ہمیشہ تازہ رکھیں گی اس اظہار تعزیت میں میری بیگم صاحبہ کا دل بھی شامل ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ خدا آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔

نرسنگ راؤ

میں اس سانحہ عظیم سے اس قدر متاثر ہوں کہ میں میری زبان میں کوئی لفظ کہنے کی طاقت نہیں ہے۔

جنار دہن دیسائی

یہ ملک کا ناقابل تلافی نقصان ہے اور آئندہ حیدرآباد میں ایسے سپوت کا پیدا ہونا غیر یقینی ہے۔

کاشی ناتھ راؤ ویدیہ

میں اس وقت گم سم ہوگیا ہوں دل و دماغ قابو میں نہیں ہے۔ میرے آنسو ہی میرے مادی تاثرات ہیں ایک بڑی قوت ٹوٹ گئی۔

مانک چند مہاراج صدر مہاراشٹرا پریشد کا تعزیتی پیام

قائد ملت کی اچانک موت سے نہ صرف مرحوم کے سیاسی ہم خیالوں کو صدمہ پہنچا ہے بلکہ ان کو بھی جو ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی لاثانی خطابت جوشیلا طرز بیان حصول مدعا کی کوششیں اور قربانی کا جذبہ قابل تقلید

خصوصیات تھیں عوام نے ایک لیڈر اور سیاست کی ایک طاقتور شخصیت کھو دی جس نے اپنے عمل سے موجودہ زمانہ میں تنظیم کے حق اور اس کی اہمیت کا پیغام پہنچایا۔ میں اور میری جماعت اس صدمۂ عظیم میں مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ شریک ہیں۔

مراٹھا منڈل

مولوی محمد بہادر خاں صاحب کے انتقال پر منڈل کو گہرا رنج ہوا۔ صاحب موصوف اتنی جلدی ہمیشہ کے لیے اپنے ملک سے جدا ہو گئے، جو ہمارے ہندو مسلم بھائیوں کی کم نصیبی کا باعث ہوا۔ ان کی یاد حیدرآباد کے ہندو مسلم بھائیوں کے دل سے ہرگز نہ مٹ سکے گی۔ چونکہ صاحب موصوف دکن کے سچے خدمت گذار تھے اور جن سے ملک کا ہر فرد بشر خوب واقف ہے۔

مراٹھا منڈل مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے غم میں اپنے آپ کو برابر کا شریک پاتا ہے۔ اور ایشور سے پرارتھنا کرتا ہے کہ ان کی آتما کو شانتی نصیب ہو اور مرحوم کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

کمیونسٹوں کا بیان

مسٹر مخدوم محی الدین، مسٹر بلا ریڈی اور مسٹر راج بہادر گوڑ اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ "مولوی بہادر خاں صاحب کے اچانک سانحہ ارتحال کی وجہ سے

ملک ایک بڑی شخصیت سے محروم ہوگیا۔ مسلمانانِ دکن کی تنظیم انجمن اتحاد المسلمین اور اس کی ترقی مرحوم کی ذات سے اس قدر پیوستہ اور وابستہ تھی کہ نہ صرف مسلمان بلکہ سارا ملک قائد کی بے وقت موت سے ایک خلا محسوس کرے گا۔ ہم حیدرآباد کے کمیونسٹ مسلم عوام کے اس شدید غم میں شریک ہیں اور اپیل کرتے ہیں جمہوریہ اسلامیہ دکن اپنے اتحاد عظیم سے اپنے قومی ادارے انجمن اتحاد المسلمین کو زیادہ سے زیادہ جمہوری اور طاقتور بنائیں تاکہ مرحوم کی تلافی ہو سکے اور مستعد و منظم عوام دوسرے عوام سے مل جل کر اہلِ ملک کے مشترکہ مسائل کو حل کر سکیں۔

قائدِ ملّت علیہ الرحمۃ

(حکومت آصفیہ کے سرکاری رسالہ "معلومات" کا اداریہ)

قائدِ ملت مولوی محمد بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور کی اچانک اور بے وقت موت پر تمام ہندوستان میں انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم نے ابھی اپنی عمر کے چالیس سال بھی پورے نہ کیے تھے اور اچانک اس عالم فانی سے رحلت فرما گئے۔ اتنی کم عمری میں قائدِ ملت کی ناگہانی موت نے اس قومی سانحہ کو اور زیادہ شدید و المناک بنا دیا ہے۔ افسوس ہے کہ قسمت کے بے رحم ہاتھوں نے ایسے زبردست انسان کا رشتۂ حیات اس قدر جلد منقطع کر دیا جو اتنی کم عمری میں عظمت و شہرت کے بام عروج پر پہنچ گیا تھا اور جس کے روشن ترین مستقبل سے ابھی اور بے شمار امیدیں وابستہ تھیں۔ قائدِ ملت بہادر خاں

مرحوم ایک بے مثل و بے نظیر مقرر تھے اور ان کے قدرتی جوہر خطابت کے علاوہ علوم اسلامی سے ان کی کامل واقفیت ان کے خلوص اور حسن نیت اور ان کی شخصیت کی غیر معمولی کشش اور جاذبیت نے بھی ان میں وہ زبردست قوت پیدا کردی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی قوم کے دل و دماغ پر ایسا قابو پالیا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے اور وہ لوگ بھی ان کی عزت کرنے لگے جو سیاسی مسائل میں ان سے متفق نہ تھے۔ قائد ملت علیہ الرحمۃ کی بے وقت موت نے حیدرآباد کی قومی زندگی اور مسلمانان ہند کی سیاست میں ایک ایسی جگہ خالی کردی ہے جس کا مدت دراز تک پُر ہونا بہت دشوار ہے۔ مرحوم نہ صرف مسلمانان حیدرآباد کی سیاسی سرگرمیوں کی جان تھے بلکہ تمام ہندوستانی ریاستوں کے مسلمانوں کی سیاست سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا کیونکہ وہ کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے بانی صدر اور روح رواں تھے۔ خدا مرحوم کی روح کو اپنے جوار رحمت میں ممتاز جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

جامعہ عثمانیہ میں جلسۂ تعزیت

حیدرآباد۔ ۲۷ امرداد۔ کلیہ فنون کی عظیم الشان عمارت میں سرزمین دکن کی عظیم المرتبت فرزند قائد ملت مولوی بہادر خاں صاحب مرحوم کے انتقال پُر ملال پر اپنے عمیق رنج و غم کا اظہار کرنے کے لیے طلباء جامعہ عثمانیہ اور اساتذہ صاحبین کی جانب سے ایک جلسہ تعزیت منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت مولوی سید محمد اعظم صاحب معین امیر جامعہ نے فرمائی۔ کارروائی کا آغاز

قراءت سے ہوا۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب نے اپنی مختصر سی تقریر میں فرمایا کہ ہم اس سانحہ پر اظہار تعزیت کے لیے جمع ہوئے ہیں جن کا رنج و ملال سب کو ہے اور وہ ہستی محتاج تعارف نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقی عظمت کی حامل ہستیاں محتاج تعارف نہیں ہوا کرتیں اور میں سمجھتا ہوں کہ رنج و غم کے اظہار کا بہترین طریقہ خاموشی ہے۔ مسٹر اعظم کی تقریر کے ساتھ ہی ساری مجلس پر مکمل خاموشی چھا گئی۔

مسٹر حامد علی متعلم ایل ایل بی نے حسب ذیل قرارداد تعزیت پیش کی جس کو حاضرین نے ایستادہ ہو کر منظور کیا۔ طلباء اساتذہ، عہدیداران و عمال جامعہ عثمانیہ کا یہ جلسہ قائد ملت مولوی محمد بہادر خاں مرحوم و مغفور کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اس سانحہ کو ملک کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔ مرحوم ملک کے مخلص خادم اور سچے جاں نثار تھے اور ہندوستان کی حریت کے علمبردار اور عالم اسلام کے مجاہد اعظم۔ یہ جلسہ بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آخر میں مولانا مناظر الحسن صاحب گیلانی نے فرمایا کہ مرحوم کی خواہش تھی کہ مسلمان نوجوان قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کے قابل ہو جائیں اور اگر مسلم نوجوانوں نے ان کی تمنا کی تکمیل کی تو ان کی روح کو مستقل ثواب ہوتا رہے گا دعائے مغفرت پر جلسہ ختم ہوا۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی کابینہ کا یہ جلسہ ملک دکن کے مایہ ناز فرزند نواب

بہادر خاں صاحب کی اچانک وفات پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے اور اس کو ملک کا ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

حیدرآبادی طلبائے علی گڑھ کی قرارداد تعزیت

ہم حیدرآبادی طلبا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو قائدِ ملت محمد بہادر خاں صاحب کے اچانک اور بے وقت انتقال پُر ملال کی خبر سن کر بے حد دلی رنج اور افسوس ہوا۔ قائدِ ملت نہ صرف مسلمانانِ دکن کے واحد قائد اور رہنما تھے بلکہ آپ کا شمار ملتِ اسلامیہ ہند کی نشاۃ ثانیہ کے معماروں میں بھی ہوتا ہے۔ آپ کی پُرزور خطابت اور اسلامی زاویہ نظر و فکر نے مسلمانوں میں وہ صحیح اسلامی جذبہ و زندگی پیدا کی جو کسی جامعہ یا درسگاہ سے بھی ممکن نہ تھی۔ آپ کی شبانہ روز کی مساعی نے مسلمانانِ دکن میں سیاسی شعور اور اجتماعی زندگی پیدا کی اس وقت جب کہ افقِ دکن پر سیاسی بادل منڈلا رہے تھے اور اغیار کی کوشش اس اسلامی سلطنت اور مغلیہ تفوق و عظمت کی آخری یادگار کو مٹانا چاہتی تھیں۔ آپ نے سینہ سپر ہو کر اغیار کے ہر حملہ کا مقابلہ کیا اور حیدرآباد کو اس بھونچال سے بچا لیا جو اس کے اطراف پیدا کیا جا رہا تھا۔ ہم خدائے بزرگ و برتر سے دست بہ دعا ہیں کہ وہ مرحوم کو اعلیٰ میں جگہ عطا فرمائے اور ان کو پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرماتے ہوئے مسلمانانِ دکن کے لیے ان کا بدل نصیب کرے۔

گلوں کی کہانی صبا کی زبانی

"گلستاں میں ہر صبح و شام نئے گل کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں روزانہ کلیاں چٹکتی ہیں اور چند دن بہار جانفزا دکھلا کر خس و خاشاک بن جاتی ہیں، نہ باغباں کو علم ہوتا ہے نہ گلچیں کو ان کی پرواہ۔

لیکن اسی چمن کی کسی شاخ سے کبھی کبھی ایسے حیات افزا اور روح پرور پھول بھی پھوٹ نکلتے ہیں جن کی خوشبو سے باغ کا گوشہ گوشہ مہک اٹھتا ہے اور جس کی رعنائی و دل سوزی کا سکہ ہر روش پر بیٹھ جاتا ہے۔"

ایسے ہی گل عطر کا لاگلاب، عطر پہاڑی پھول، عطر سہاگ عطر کچی کلی کے نام سے خوشبو کی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتے ہیں

اور ہم ان عطریات کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

(بنانے والے)

حیدرآباد زردہ ورکس

مسجد پتھر گٹی - پتھر گٹی حیدرآباد